ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری

DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY

JAMIA MILLIA ISLAMIA
JAMIA NAGAR

NEW DELHI

Please examine the book before taking it out. You will be responsible for damages to the book discovered while returning it

DUE DATE

Jc

Cl. No. 811.709
168M9

Acc. No. 120432

Late Fine Ordinary books 25 p. per day, Text Book Re 1 per day, Over night book Re 1 per day.

آزادی کے بعد

دہلی میں اردو غزل

آزادی کے بعد

دہلی میں اردو غزل

مرتبہ

پروفیسر عنوان چشتی

کتب خانہ انجمن ترقی اردو

اردو اکادمی دہلی

Dr. ZAKIR HUSAIN LIBRARY

سلسلہ مطبوعات اردو اکادمی ۳۸

جملہ حقوق محفوظ

تحقیقی و اشاعتی کمیٹی کے اراکین :-
پروفیسر قمر رئیس (چیئرمین)
پروفیسر عنوان چشتی
پروفیسر فضل الحق
ڈاکٹر فہمیدہ بیگم
سید شریف الحسن نقوی (سکریٹری)

120432
27.12.89

اکادمی کی تمام مطبوعات چھپی ہوئی قیمت کے مطابق خریدیے

AZAADI KE BAAD

DELHI MEIN URDU GHAZAL

Ed. by Prof. Unwan Chishti

Rs.61-OC

سنِ اشاعت : جولائی ۱۹۸۹ء ۔ تعداد : ۳۰۰
قیمت : ۶۱ روپے
بہ اہتمام : ڈاکٹر انتظار مرزا
خوش نویس : وکیل الرحمٰن ملک
طباعت : ثمر آفسٹ پرنٹرس نئی دہلی ۲
ناشر و تقسیم کار : اردو اکادمی دہلی۔ گھٹا مسجد روڈ۔ دریا گنج نئی دہلی ۲
ISBN 81-7121-038-4

فہرست

حرفِ آغاز

دہلی ہندوستان کا دل ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ شہر اپنی تہذیبی روح، ثقافتی رنگا رنگی اور تاریخی کردار کے اعتبار سے ایک چھوٹا سا ہندوستان ہے۔ دہلی کلچر کے فروغ میں اُردو نے ایک تاریخ ساز کردار ادا کیا ہے، اور آج بھی یہ زبان اس کی ادبی و تہذیبی شناخت کا ایک اہم وسیلہ ہے۔ اردو کلچر کی اہمیت اور دہلی کی ثقافتی زندگی سے اس کے گہرے رشتے کے پیشِ نظر آنجہانی محترمہ اِندرا گاندھی سابق وزیرِ اعظم مرکزی حکومت ہند کے ایما پر ۱۹۸۱ء میں اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا تھا۔

اکادمی کا اپنا ایک انتظامی ڈھانچہ اور طے شدہ دستور العمل ہے۔ دہلی کے لفٹیننٹ گورنر اس کے صدر نشین (چیرمین) ہیں اور اکادمی کے اراکین کو دو سال کے لیے نامزد کرتے ہیں۔ ان اراکین میں ممتاز اہلِ قلم، ادیب، نقاد، صحافی، معلّم اور محقّق شامل ہیں۔ اکادمی دہلی اور بیرونِ دہلی کے دوسرے علمی، ادبی، تہذیبی اور تعلیمی حلقوں سے بھی رابطہ قائم رکھتی ہے اور اپنی سرگرمیوں میں اُن کے تعاون اور مشوروں کو خوش آمدید کہتی ہے۔

ہمیں احساس ہے کہ کتاب انسان کا بہترین ساتھی ہے اور کتاب کا مطالعہ اس کا شریف ترین مشغلہ۔ کتاب ماضی کو حال اور حال کو مستقبل سے جوڑنے کا سب سے عمدہ وسیلہ ہے۔ اپنے اس بیش بہا ورثے کو محفوظ کرنا اسے خوب تر اور مفید تر بنانا ہمارے تہذیبی فرائض کا سب سے اہم حصّہ ہے۔ یہ گویا ادبی روشنیوں کو عام کرنا اور علمی خوشبوؤں کو پھیلانا ہے۔

اکادمی نے نہایت اہم موضوعات پر اچھی کتابوں کی اشاعت کا جو منصوبہ بنایا ہے "آزادی کے بعد دہلی میں اردو غزل" اسی سلسلۂ پیش کش کا ایک حصہ ہے۔ غزلوں کا انتخاب کچھ مطبوعہ اور کچھ غیر مطبوعہ ہے۔ اکادمی کے سرگرم رکن پروفیسر عنوان چشتی صاحب نے بڑی جاں فشانی اور باریک بینی سے غزلوں کا انتخاب کیا ہے اور اس پر ایک دلکش اور خیال انگیز مقدمہ بھی تحریر کیا ہے اس کے لیے ہم فاضل مرتّب کی علمی کاوشوں کے ممنون ہیں اور اس تعاون کے بھی جو اشاعتی کمیٹی کے ارکان کی طرف سے ہمیں میسّر آتا ہے اور ہمارے لیے روشنی و رہنمائی کا باعث بنتا ہے۔ اس کے علاوہ دہلی کی تاریخ و ادبیات سے متعلق کچھ ایسی اہم کتابیں بھی شائع کی گئی ہیں جو کمیاب بلکہ نایاب ہو چکی تھیں۔ ایسی مزید کچھ کتابیں ترتیب و اشاعت کے مراحل سے گزر رہی ہیں۔

ہم اپنے موجودہ سرپرست اور اکادمی کے صدر نشین جناب رومیش بھنڈاری صاحب، لفٹیننٹ گورنر دہلی، کی عنایات اور توجہات کے بے حد ممنون ہیں۔ ایگزیکیٹو کونسلر (تعلیم) جناب کلانند بھارتیہ کی عنایت کا بھی اعتراف ہے اور ان کی رہنمائی کے لیے بھی شکر گزار ہیں۔

سیّد شریف الحسن نقوی

سکریٹری

اردو اکادمی، دہلی

منظر نامہ

(مقدّمہ)

از :- پروفیسر عنوان چشتی

دہلی ایک بین الاقوامی شہر ہے۔ سیاسی، ادبی، ثقافتی اور سماجی تحریکوں کا سرچشمہ ہے۔ اور زندگی کی مثبت اور منفی لہروں کا گہوارہ بھی۔ اس لیے دہلی کے اکثر افراد، عام انسانوں کے مقابلہ میں زیادہ حسّاس اور باشعور ہیں۔ انھیں اپنے ماضی سے روشنی لے کر، حال کو سمجھنے اور مستقبل پر نگاہ رکھنے کے زیادہ مواقع حاصل ہیں۔ دہلی کے ادیبوں اور شاعروں نے اپنے ذہن و دل کے دریچے تازہ ہواؤں کے لیے کھلے رکھّے ہیں۔ انھوں نے اپنی جڑوں پر استوار رہ کر ہر تازہ جھونکے کا خیر مقدم کیا ہے۔ ہر نئی روشنی کو دیدہ و دل میں بسایا ہے۔ اور ہر نئے تجربے کا اپنی زندہ و تابندہ روایات کے تناظر میں خیر مقدم کیا ہے۔ دہلی کی شاعری نے ایک طرف ان رجحانات کو قبول کیا ہے، جو ہماری سماجی اور تہذیبی تاریخ سے وابستہ ہیں۔ دوسری طرف ان تحریکوں کے اثرات کو اپنایا ہے۔ جو دوسری زبانوں اور ادبوں سے مخصوص ہیں۔ اس ضمن میں اردو زبان عام طور پر، اور اردو شاعری خاص طور پر خوش نصیب ہے کہ اس نے قومی زبانوں کے ادبی رجحانوں کے ساتھ بین الاقوامی ادبی تحریکوں اور میلانوں کے اثرات کو قبول کیا ہے۔ مگر یہاں یہ نکتہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اردو زبان و شاعری اور ہماری اپنی سماجی اور تہذیبی زندگی کا ایک

مخصوص مزاج ہے۔ اس لیے اردو شاعروں نے زندگی کی تبدیلیوں اور تحریکوں کے اثرات اپنے مزاج اور منہاج کے مطابق قبول کیے ہیں۔ آزادی کے بعد دہلی کی اردو غزل نے زندگی کا لمحہ بہ لمحہ ساتھ دیا ہے۔ اور اس سے طاقت حاصل کر کے اس کو بامعنی اور روح پرور بنانے میں تعاون دیا ہے۔ جس کا ثبوت آزادی کے بعد دہلی کی اردو غزل ہے۔

اردو زبان و ادب کی تاریخ شاہد ہے کہ زبان کی ترقی سے ادب کی ترقی، اور ادب کی ترقی سے زبان کی ترقی ہوتی ہے۔ جب زبان ارتقا کے مراحل طے کرتی ہے تو اس میں زندگی کے گمبھیر مسائل اور نازک اور نادر تجربے کے اظہار کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جب ادب اور شعر ارتقا کے مراحل طے کرتا ہے تو وہ علمی اور تخلیقی سطح پر زبان کی نئی نئی صورتوں اور پیکروں کی تخلیق کرتا ہے۔ دبستانِ لکھنؤ اور دبستانِ دہلی کے ممتاز اساتذہ نے یہ کام دو سطحوں پر انجام دیا ہے۔ ایک طرف انھوں نے زبان، عروض اور فن کے قاعدوں کی تشکیل کی ہے۔ اور ان پر سختی سے عمل کیا ہے۔ جس کو معیار بندی کا رجحان کہا جا سکتا ہے۔ دوسرے مجازی زبان کے امکانات کو تخلیقی انداز سے برتا ہے۔ جس کو تخلیقی رجحان کہا جا سکتا ہے۔ دبستانِ دہلی کے اساتذہ اور شعرا نے ان دونوں رجحانوں کو پروان چڑھایا ہے۔ جہاں تک پہلے رجحان کا تعلق ہے، جس کو معیار بندی کا رجحان کہا جا سکتا ہے۔ یہ بہت طاقت ور شکل میں دکھائی دیتا ہے۔ شاہ نصیر اور استاد ذوق نے جو قاعدے مرتب کیے تھے۔ جہاں استاد مرزا داغ نے نہ صرف یہ کہ ان پر عمل کیا اور اپنے شاگردوں سے ان پر عمل کرایا بلکہ مختارات و متروکات اور فنِ شعر کے سلسلہ میں بعض نئے قوانین مرتب کیے۔ اور اس روایات کو آگے بڑھایا۔ دہلی کے ان تمام شاعروں نے اِن اصولوں پر عمل کیا، جو استادی شاگردی کی روایت سے وابستہ رہے۔ یہ سلسلہ آزادی کے بعد تک قائم ہے۔ خاص طور پر داغ کے شاگردوں اور ان کے دبستان کے نوواردوں کے یہاں صحتِ زبان و بیان کا یہی تصوّر کار فرما ہے۔۔۔ اس رجحان کے علم برداروں نے ایک طرف روزمرّہ اور محاورہ کی صحت، تراکیب کی درستی اور زبان کی سلاست اور فصاحت پر زور دیا ہے۔ اور دوسری

طرف لہجے اور اندازِ بیان کا خاص خیال رکھا ہے۔ اس رجحان کی بنیاد عربی و فارسی شعریات پر ہے۔ یہ اصول، علمِ لغت، علمِ بیان، علمِ قواعد، علمِ بدیع، علمِ بیان اور علمِ عروض و قافیہ سے ماخوذ ہیں جنھیں اساتذہ نے "معائبِ سخن" اور "محاسنِ سخن" کا نام دیا ہے۔ وہ نقائص، جو شعری ہیئت کے حُسن کو مجروح کرتے ہیں، "معائبِ سخن" میں شامل ہیں۔ اور وہ خوبیاں، جو ہیئت کے جمال میں اضافہ کرتی ہیں، "محاسنِ سخن" کہلاتی ہیں۔ "معائبِ سخن" میں عیوبِ قوافی، عیوبِ بحر، عیوبِ زبان اور دیگر نقائصِ ہیئت شامل ہیں۔ عیوبِ قوافی میں ایطا، اکفا، اقوا، سناد وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ غلو، تعدی، تضمین، تغیرّ، معمولہ، تعریف اور اختلافِ حرفِ روی پر بھی اس نقطۂ نظر سے سوالیہ نشان قائم کیا جاتا ہے۔ اس نظامِ قوافی میں حرفِ روی کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے انگریزی کی طرح اردو میں خطّی، بصری اور صوتی قوافی کی گنجائش نہیں۔ جن شاعروں نے صوتی قوافی (میراث اور احساس) برتے ہیں۔ انھیں زیادہ سے زیادہ ایک تجربے کا نام دیا جاتا ہے ـــــــ عیوبِ بحر میں حروفِ صحیح کا سقوط اور عربی و فارسی الفاظ کے حروفِ علّت کا سقوط شامل ہے۔ بعض بحروں میں شکستِ ناروا وارد ہوتا ہے۔ داغ اسکول کے اکثر اساتذہ نے اس کو عیب گردانا ہے۔ لیکن بعض شعرا شکستِ ناروا اور عربی و فارسی کے حروفِ علّت کے سقوط کو روا رکھتے ہیں۔ مگر اکثریت ان دونوں صورتوں سے اجتناب کرتی ہے۔ چونکہ غزل کا سانچہ عروضی نقطۂ نظر سے زیادہ لچک دار نہیں ہے۔ اس لیے اوزان و بحور کے نقطۂ نظر سے ذرا سی بے اعتدالی بھی بہت زیادہ کھٹکتی ہے۔ خاص طور پر بحرِ متدارک اور متقارب میں مشّاق شعرا بھی دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ دہلی کے اساتذہ اور شاعروں نے عروضی چابک دستی کا لحاظ رکھا ہے۔ عیوبِ زبان میں محاورہ کی صحت، روزمرّہ کی درستی اور صحتِ زبان کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ عیوبِ ہیئت میں بہت سی صورتیں شامل ہیں۔ جس میں شتر گربہ، تنافرِ حروف، توالیِ اضافت اور تعقید وغیرہ شامل ہیں ـــــــ اس رجحان کے علم بردار ایک طرف شعری ہیئت کو ان نقائص سے پاک رکھتے

ہیں، جو اس کے جمال کو مجروح کرتے ہیں۔ اور دوسری طرف ایسی مثبت صورتوں، طریقوں اور وسیلوں کو اختیار کرتے ہیں، جن سے ہیئت کے جمال میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس میں لب و لہجہ کی کرامتیں اور اندازِ بیان کی لطافتیں بھی شامل ہیں۔ مثلاً

انھیں دیکھا تو زاہد نے کہا، ایمان کی یہ ہے
کہ اب انسان کے سجدہ روا ہونے کا وقت آیا

(ہری چند اختر)

دنیا کے ہیں نہ دین کے دلبر کے ہو گئے
ہم دل سے کلمہ گو، کسی کافر کے ہو گئے

(خار دہلوی)

یہ کون ہے جسے آئینہ منھ دکھا نہ سکا
یہ کس کو اہلِ نظر بے مثال کہتے ہیں

(طالب دہلوی)

خانۂ دل میں داغ جل نہ سکا
اس میں کوئی چراغ جل نہ سکا

(عرش ملسیانی)

کیسے اُن راہ نماؤں پہ بھروسہ ہو کر جو
کل سفیدوں میں تھے اور آج سیاہوں میں ملے

(آنند نرائن ملا)

یہ مجھ سے مشورہ کیوں ہے مری قسمت کے بارے میں
تمھارا فیصلہ جو ہے، وہی ہے فیصلہ میرا

(منوّر لکھنوی)

دل میں ہیں، لیکن انھیں دل سے غرض مطلب نہیں
اپنے گھر میں رہتے ہیں، وہ مہمانوں کی طرح
(بیخود دہلوی)

ان اشعار میں زبان کی صحت کے ساتھ عروضی وفنی چابکدستی ملتی ہے۔ اور لب ولہجہ کا حسن بھی شامل ہے۔ یہاں یہ بات خاص طور پر کہنے کی ہے کہ شاعری کے ہیئتی یا لسانی پہلو پر ریاضت کا عمل محض روایت رستی نہیں ہے۔ بلکہ اس طرح اساتذۂ فن اپنے عمل کو ایک نظریاتی اساس فراہم کرتے ہیں۔ اور اپنے نظریے کو عملی جامہ پہناتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہر فنِ لطیف کا ایک ذریعۂ اظہار ہے۔ اور اظہار کے چند بنیادی اصول ہوتے ہیں۔ مثلاً فنِ مصوّری کا ذریعۂ اظہار رنگ اور الوان ہے'۔۔۔ فنِ رقص کا ذریعۂ اظہار بدن اور حرکاتِ بدن ہیں۔ موسیقی کا آواز اور اس کا زیروبم، بت گری کا سنگ اور اس کے تراش خراش، اسی طرح شاعری کا ذریعۂ اظہار زبان، عروض اور فن کے ضابطے ہیں جس طرح موسیقار، رقّاص، مصوّر اور بت گر اپنے وسائلِ اظہار سے بے نیاز نہیں ہو سکتا، اسی طرح شاعر بھی اپنے مخصوص وسیلۂ اظہار یعنی زبان اور فن کے اصولوں سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔ اس دلیل میں وزن ہے۔ جو شعراء اپنے وسیلۂ اظہار کا احترام نہیں کرتے، وسیلۂ اظہار بھی ان کے تخلیقی تجربوں کو اعتبار اور استناد عطا نہیں کرتا۔ لیکن اس عمل میں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ زبان وبیان نیز عروض وفن کی صحت ہی شاعری کی معراج نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو شاعری کے تخلیقی تجربوں کی صورت گری کا وسیلہ ہے۔ اس لیے شاعری کے معنوی پہلو پر بھی خاص توجہ کرنی چاہیئے۔ تاکہ وسیلۂ اظہار سے معنویت کو اور تخلیقی تجربے کی بنیادی خصوصیت سے اظہار کی خارجی صورتوں اور وسیلوں کو تقویت حاصل ہو۔ اچھی اور سچّی شاعری کے لیے دونوں پہلوؤں کا دلکش، بصیرت افروز اور جمال آفریں ہونا ضروری ہے۔ آزادی کے بعد کی کلاسیکی مزاج کی غزل میں خوشگوار پہلوؤں کی کمی نہیں ہے۔

تغزل، عہدِ قدیم ہی سے دبستانِ دہلی کی اہم خصوصیت ہے۔ جس میں خارجیت پر داخلیت کو، نشاطیت اور کام جوئی پر حزنیت اور دلگدازی کو فوقیت حاصل رہی ہے۔ اگرچہ تغزل کی اصطلاح

تعبیروں کی کثرت سے خواب پریشاں بن چکی ہے۔ پھر بھی اس کے دو مفہوم بہت واضح ہیں۔ ایک یہ کہ تغزل کا تعلق معانی اور مواد سے ہے۔ خاص طور پر اس کا دائرہ حسن و عشق پر محیط ہے۔ دوسرا یہ کہ تغزل ایک طرزِ ادا یا رنگ ہے، جس میں نغمگی، نفاست، لوچ اور نفاست شامل ہے۔ اگر تغزل کے دونوں پہلوؤں کو مدِ نظر رکھا جائے تو تصویر مکمل ہوتی ہے۔ جہاں تک حسن و عشق کا تعلق ہے، قدیم دلبستانِ دہلی میں ایک طرف امرد پرستی کا رنگ تھا۔ دوسری طرف صنفِ نازک بھی پوری دلربائی کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ اس ضمن میں اگر میر کے "پسرِ زرگر" یا عطار کے لونڈے کا ذکر کیا جا سکتا ہے تو خود میر کی پری "تمثال عزیزہ" غالب کی "ستم پیشہ ڈومنی" اور مومن کی "امت الفاطمہ صاحبہ جی" کے اثرات سے مجالِ انکار نہیں۔ اسی طرح تغزل کے خارجی پہلو میں اگر سراپا نگاری کی مینا کاری نظر آتی ہے تو دوسری طرف داخلی کیفیات اور جذبوں کی قوسِ قزح بھی مچلتی ہوئی ملتی ہے۔ اگر ایک طرف وصال کا رنگ ہے تو دوسری طرف ہجر کا آہنگ بھی ہے۔ اور ان کے ساتھ، عاشق کی نفسیاتی کیفیات اور محبوب کی دلربائی کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ غرض تغزل میں حسن و عشق کا پورا منظر نامہ شامل ہے ــــــ جہاں تک طرزِ ادا اور رنگ کی حیثیت سے "تغزل" کی تعبیر کا سوال ہے اس سلسلے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ تغزل کی بنیاد چونکہ "صنفِ نازک" کی گفتگو یا اس سے گفتگو" پر ہے۔ اس لیے اسی میں تہذیب کی وہ صورت نظر آتی ہے، جس پر خود تہذیب ناز کرتی ہے۔ اس میں نفاست، اور نزاکت، طرح داری اور بانکپن، محبت، اور دلسوزی، دردمندی اور دلگدازی کے سارے رنگ اپنی پوری توانائی کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اس لیے "تغزل" بظاہر ایک قدیم، پیش پا افتادہ اور روایتی اصطلاح ہے۔ لیکن بنیادی طور پر یہ شاعری کا ایک اہم رجحان، مظہر اور مزاج ہے۔ جس کے بغیر شاعری کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ تغزل کے سلسلہ میں یہ نکتہ بھی بہت اہم ہے کہ یہ غزل کے فنی اور جمالیاتی تقاضوں پر بھی محیط ہے۔ اس لیے اس میں جمالیاتی کیفیت اور تہذیبی رچاؤ کے ساتھ فنکارانہ جمال بھی ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے تغزل، "سحرِ حلال" بن جاتا ہے۔ اور دلوں کا رشتہ دلوں سے جوڑ کر تاثیر اور

توانائی کا مشک نافہ بن جاتا ہے۔ جو غزل کے پڑھنے اور سننے والوں کے ذہن و ضمیر کو متاثر کرتا ہے اور شاعر کے داخلی تجربوں کی عکاسی کرتا ہے۔ تغزل کے ذریعہ، ذہنی، وجدانی اور داخلی کیفیات کا اظہار ہوتا ہے۔ آزادی کے بعد بھی دہلی کے شاعروں نے اپنی غزلوں میں تغزل کی فضا کو بڑی خوبی سے برقرار رکھا ہے۔ اور اس میدان میں نئے جوہر دکھائے ہیں۔ مثلاً

محبت تم بھی کرتے ہو، محبت ہم بھی کرتے ہیں
مگر دونوں میں منھ دیکھی محبت کون کرتا ہے
(افضل پشاوری)

کتنے سبک دل ہوئے تجھ سے بچھڑنے کے بعد
اُن سے بھی ملنا پڑا، جن سے محبت نہ تھی
(انور صدیقی)

مِل گیا رنگ بھی تخلیق میں تیری..... ورنہ
صرف نکہت تو مجسّم نہیں ہونے پاتی
(بسمل سعیدی)

جلتی آنکھ، سلگتے آنسو، ہجر کے دہکے انگارے
پروائی لے کر آئی ہے، موسم کی یہ سوغاتیں
(جاوید وششٹ)

میں اُس کے جسم کی ناگن پکار سُن بھی چکا
اب اُس کی آنکھ میں رکھا ہی کیا فسوں کے سوا
(حسن نعیم)

بہت آئے دلوں کی نذر لے کر
مگر تیرا سا دِل ہم کو ملا نہیں
(مسعودہ حیات)

مرے چاروں طرف پھیلی ہے حرف و صوت کی دنیا
تمھارا اس طرح ملنا، کہانی بن کے پھیلے گا
(زبیر رضوی)

جس راہ سے وہ گزریں ہر گام بہاراں ہو
اک جسم نہیں چلتا ماحول بھی چلتا ہے
(سیفی پریمی)

محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں
یہ وہ نغمہ ہے، جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا
(مخمور دہلوی)

دل اک چراغِ سرد ہے لیکن کبھی کبھی
لو دے اُٹھے ہے، شعلۂ رخسار دیکھ کر
(مشیر جھنجھانوی)

ان اشعار میں مُنھ دیکھی محبت کون کرتا ہے۔ کا تیکھا سوال کرنا، محبوب سے بچھڑنے کے بعد غیروں تک سے ملنے پر مجبور ہونا، محبوب کا رنگ و نکہت کا پیکر ہونا، آنسوؤں اور جلتی آنکھوں کو موسمِ عشق کی سوغات قرار دینا، محبوب کے جسم کی ناگن پکار سُننا، دل کے ہزاروں نذرانوں میں کسی ایک دل کو قابلِ توجہ خیال کرنا، محبوب سے ملاقات کی خبر کا کہانی بن کر پھیل جانا، اک جسم کے چلنے سے ماحول کو متحرک محسوس کرنا، محبت کو خاص دلوں سے مخصوص تصور کرنا، محبوب کے دہکتے رخساروں کو دیکھ کر دل کے چراغ کا لو دے اٹھنا، محض یونہی نہیں۔ بلکہ ان استعاروں اور پیکروں میں شاعروں نے اپنے داخلی تجربات، حسّی کیفیات، وجدانی محرکات اور اپنی کیفیات کو پیش کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان اشعار میں ایک طرف رنگ افشاں جذبات، مجروح تمنّاؤں اور شکستہ خوابوں کا رقصِ جمیل نظر آتا ہے تو دوسری طرف بدن اور اس رنگِ بدن کی دلنواز

سحر کاریاں، محبت اور اس کی ستم رانیاں مہذب، سنجیدہ اور روح پرور انداز میں جلوہ ریز ہیں۔

زندگی ایک نامیاتی حقیقت ہے۔ اس کا اپنا مزاج ہے۔ جب درخت کے کچھ پتّے زرد ہو کر شاخوں سے جھڑنے لگتے ہیں، تو ان کی جگہ نئی کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں۔ درخت سے پتّوں کے سوکھنے، زرد ہونے اور جھڑنے کا عمل، نیز نئی کونپلوں کے پھوٹنے، اگنے بڑھنے اور لہلہانے کا عمل ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ یہ کیفیت زندگی کی ہر سطح پر نظر آتی ہے۔ ادب، تہذیب اور سماج کی سطح پر موت و حیات عروج و زوال اور اتار چڑھاؤ کا یہی رقصِ مسلسل نظر آتا ہے۔ اردو شاعری، اس اصول سے مبرّا نہیں۔ اس لیے اس میں زندگی کے کرب و کیف، جلال و جمال، شکست و فتح، اور شکستِ رنگ کا ہر منظر نامہ دکھائی دیتا ہے۔۔۔ انسان کے ذہن پر زندگی کی تبدیلیوں کا اثر لازمی طور پر ہوتا ہے۔ اور انسان کے ذہن کے مدّوجزر اس کی تخلیق میں زیریں لہروں کی طرح شامل ہو جاتے ہیں۔ انسان ایک طرف حسّاس مخلوق ہے، دوسری طرف "سوچتا ہوا ذہن" بھی رکھتا ہے۔ اس لیے وہ زندگی کی لغویت، عدم تحفظ یا تبدیلیوں کے نتیجہ کے طور پر اپنی ذات اور کائنات کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔ "سوچنا" یوں بھی انسانی ذہن کا مخصوص عمل ہے۔ وہ اس "سوچ" میں ایک طرف اپنے ذہن کے نہاں خانوں کے ذاتی اور نسلی تجربوں سے اخذِ نور کرتا ہے اور دوسری طرف اُن اقدار و افکار سے طاقت حاصل کرتا ہے، جو اس کو سماجی، تہذیبی اور عملی تجربوں نے عطا کیے ہیں۔ اس لیے عام طور پر ہر انسان کا اور خاص طور پر ہر شاعر کا ذہن فکر کا تارِ حریر دو رنگ، تیار کرتا ہے۔ جس سے وہ اپنے فن کی جمالیاتی قوسِ قزح تخلیق کرتا ہے۔ اس منزل میں عام طور پر شاعر، زندگی کے گہرے، لبیط، نازک اور نادر پہلوؤں اور اُن کے اثرات و مضمرات کو اپنے فن کا محور بناتا ہے۔ حیات اور کائنات پر غور کرتا اور اس کو جمالیاتی زبان عطا کرتا ہے۔ آزادی کے بعد دہلی کے اردو شاعروں نے اس میدان میں بھی اپنے جوہرِ طبع دکھائے ہیں۔ اور انھوں نے اپنی شاعری کو عصری حسیّت اور عصری آگہی کا نگار خانہ بنا دیا ہے۔ مثلاً

اس جگہ کھونے کا، پانے کا عجب مفہوم ہے
ہم نے آکر جس جگہ کھویا بہت، پایا بہت
(جگن ناتھ آزاد)

میں خال و خد کا سراپا، تصورات میں تھا
دمکتی ذات کا سورج اندھیری رات میں تھا
(حیات لکھنوی)

نام ہے آدمی تو کیا، اصل میں روحِ عشق ہوں
ساری زمیں ہے میرا گھر، سارا جہاں مرا وطن
(درشن سنگھ)

سب حجابات ہیں اسرارِ خود آگاہی کے
کبھی قطرہ، کبھی دریا، کبھی طوفاں ہونا
(روش صدیقی)

خون میں تر کھتیں ساری پرتیں
ہم نے اک دن چھیلا پتھر
(ساحر ہوشیارپوری)

نہ داستانِ بتکدہ، نہ قصۂ حرم کہیں
کچھ آدمی کا غم سنیں کچھ آدمی کا غم کہیں
(شمیم کرہانی)

وہ دست طلب ہوں جو دعا کو نہیں اٹھتا
جو لب پہ کسی کے نہیں آتی وہ دعا ہوں
(مغیث الدین فریدی)

سکھ کے سپنے کامناؤں کے کھلونے
پھول ہیں یہ میرے من کے انگنا کے
(کرشن موہن)

خود اس کے حُسن کو بھی تماشا کرے کوئی
صانع جو روئے گل کا ہے، جسمِ غزال کا
(تلوک چند محرومؔ)

ان اشعار میں شاعروں نے اگرچہ زبان کے ترسیلی عناصر کا استعمال کیا ہے۔ مگر اسی ے ذریعہ زندگی کے گہرے اور بسیط پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ زندگی میں کھونے اور پانے عجب مفہوم ہونا، اندھیری رات میں دمکتی ذات کا سورج ہونا، انسان کو روحِ عشق قرار بنا، مظاہرِ زندگی کو اسرارِ خود آگاہی قرار دینا، پتھر کی پرتوں کو خون میں تر دیکھنا، آدمی کے غم ہنے اور سننے کی آرزو کرنا، خود کو دستِ نارسیدہ اور دعائے نامراد قرار دینا، سکھ کے سپنوں ور کامناؤں کے کھلونوں کو من کے انگنا کے پھول قرار دینا، اور جسمِ غزال نیز روئے گل کے انع کا تماشا کرنے کی تمنا کرنا، محض یوں ہی نہیں۔ بلکہ ان استعاروں اور پیکروں میں زندگی کا ہرا عرفان کار فرما ہے۔ اپنی ذات کی گہرائیوں میں ڈوب کر سراغِ زندگی پانے کی شدید خواہش ضطرب ہے۔ کائنات کے سربستہ اسرار پر ایک نئے مگر تخلیقی انداز سے سوچنے کی کیفیت ہے۔

س سلسلہ میں یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ بعض شاعروں کے یہاں فکر کا عنصر بہت غالب ہے س کی بنیاد زندگی کے تقدس، وقار اور احترام پر ہے۔ کسی نے اسلامی تصوّف سے، کسی نے ندو دیو مالا اور تہذیب سے، کسی نے تاریخِ انسانی سے روشنی حاصل کی ہے۔ اور اپنی ناعری کا گمبھیر اشاریہ تیار کیا ہے مختصراً کہا جاتا ہے کہ اکثر شاعروں نے اپنی استعداد اور ملاحیت کے مطابق زندگی زمانے اور ذات کے الگ الگ فکری سرچشموں سے اخذِ نور کر کے س کو جمالیاتی زبان میں پیش کیا ہے۔

یوں تو رجائی عناصر، اردو غزل میں ابتدا سے ہی ملتے ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ رجائی عناصر، اردو غزل کے ضمیر اور خمیر میں شامل ہیں۔ لیکن ترقی پسند تحریک نے ان عناصر کو ایک نیا رنگ بخشا ہے۔ ترقی پسند نظریہ کی بنیاد "جدلیاتی مادیت" پر ہے۔ جس کے تحت مادّہ بنیادی حقیقت ہے۔ جو متحرک اور نمو پذیر ہے۔ اس لیے ترقی پسندوں نے اپنے رویّے سے عام طور پر وجدان اور روحانی اقدار کی تکذیب کی ہے۔ اور ان کی برکتوں سے استفادہ نہیں کیا ہے۔ ترقی پسند نے فرد اور سماج کے ہر عمل کو معاشیات کے آئینہ میں دیکھا ہے، اور پیداوار نیز طریقۂ پیداوار کی تبدیلیوں کو بنیادی محرکات قرار دیا ہے۔ چونکہ ترقّی پسندی ادب اور شاعری کو زندگی کے میدان میں ایک حربہ تصوّر کرتی ہے۔ اس لیے اس نے گہری مقصدیت اور افادیت پر زور دیا ہے۔ رمزیت پر وضاحت کو، اسلوب پر خیال کو، استعارہ سازی پر براہِ راست اندازِ بیان کو فوقیت دی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ مُضر اور مہلک تصورات پر کاری ضرب لگائی ہے۔ منفی اندازِ فکر سے انحراف کر کے رجائیت کا پرچم لہرایا ہے۔ اور زندگی کے خوش آئند مستقبل کی بشارت دی ہے ــــ ترقی پسندی کے نظریات کی چھوٹ ادب کے دوسرے شعبوں کے ساتھ غزل پر بھی پڑی ہے۔ لیکن غزل کا اپنا ایک مخصوص مزاج ہے۔ اس کے اپنے مخصوص فنی اور جمالیاتی تقاضے ہیں۔ اس لیے غزل نے برہنہ ترقی پسندی اور نظریاتی جبر کے تصوّر کو رد کر کے ایک مہذّب اور متوازن اندازِ فکر کو قبول کیا ہے، اردو غزل میں یہ کس بل ایک طرف ترقی پسند نظریات سے آیا ہے اور دوسری طرف ان اخلاقی اور روحانی تحریکوں کی دین بھی ہے، جو ہر اندھیرے اور آندھی کے رُخ پر چراغ رکھنے پر اصرار کرتی ہیں۔ کچھ نئے دور کے انسان کی سخت جانی کا اثر بھی ہے کہ وہ ہر ناسازگار ساعت میں "زندگی کرنے کا ہنر" جانتا ہے۔

مقصد یہ ہے کہ اردو غزل میں رجائیت، اور صحت کے محرکات بہت سے ہیں۔ اور یہ اردو غزل کے ضمیر اور خمیر میں شامل ہیں۔ عہدِ جدید، خاص طور پر آزاد ہندوستان کے دہلی

کے شاعروں نے اس رجحان کو نہ صرف یہ کہ باقی رکھا ہے۔ بلکہ اس کو اپنے تخلیقی تجربوں کا نگارخانہ بنایا ہے۔ ذیل میں اس نوع کے کچھ اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

کوئی زنجیر ٹوٹی تھی یا دل کی آواز تھی
دائرے سے بناتی ہوئی کیوں، صدائیں چلیں
(اظہار اثر)

وقت کے ہاتھوں ضمیر شہر بھی مارا گیا
رفتہ رفتہ موجِ خوں سر سے گزرتی جائے ہے
(غلام ربانی تاباں)

وہ وقت کا غلام، تو یہ نام کا فقیر
کیا بادشاہ وقت میاں؟، اور کیا فقیر
(شجاع خاور)

بڑھنے لگا ہے زہرۂ گیتی کا بانکپن
چھونے لگا ہے چاند کو انسان، چپ رہو
(سلام مچھلی شہری)

تھا چراغِ شعلہ رُو سے روشنی کا کچھ بھرم
آفتابِ زرد رُو سے بڑھ گیا پندارِ شب
(شمیم عثمانی)

چاروں طرف بلند نشاں تیرگی کا تھا
رکھا ہوا فصیل پہ سر روشنی کا تھا
(محسن زیدی)

تری تلاش میں دار و رسن کی راہوں سے
کبھی چلے تو ہمیں خانماں خراب چلے
(مہدی نظمی)

سر بلند اپنا لہو تھا، سرنگوں قاتل کی تیغ
ہم ہتھیلی پر جو سر اپنا اٹھا کر لے گئے
(شہاب جعفری)

ان اشعار میں، دائرے بناتی ہوئی صداؤں کو زنجیر کے ٹوٹنے کی آواز یا صدائے شکستِ دل قرار دینا، وقت کے ہاتھوں ضمیرِ شہر کے مارے جانے کا احساس کرنا، بادشاہ کو غلام اور فقیر کو نام کا فقیر تصور کرنا، زہرۂ گیتی کے بانکپن کے سبب انسان کا چاند کو چھونے کا حوصلہ کرنا' آفتاب زرد رُو پر چراغِ شعلہ رو کو فوقیت دینا، تیرگی کے علم بلند ہونے پر روشنی کا سر فصیل پر دکھا ہوا محسوس کرنا، خانہ خرابوں کا دار و رسن کی راہوں سے گزرنا، اپنا سر اپنی ہتھیلی پر اٹھا کر لے جانے پر سر بلند اور سرخرو محسوس کرنا، اپنی جگہ زندگی کی گہری بصیرت کے ساتھ رجائیت' کس بل اور جگر کاری کا جمالیاتی اظہار ہے۔ دہلی کے شاعروں نے انسان کے ارادوں کی صلابت، زندگی کی برق رفتاری، اور کائنات کی تقدیس کا رزمیہ لکھا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان اشعار میں زندگی کی خوشبو اور اس کا جادو دونوں چیزیں ہیں، وہ لوگ جو صرف ان نغموں کو شیریں تصور کرتے ہیں، جن کی جڑیں ہمارے المیہ جذبات میں ہوتی ہیں۔ ان اشعار کی شیرینی، شگفتگی اور دلکشی کے ساتھ ان کی تاثیر، دل نوازی اور سحر کاری کو بھی محسوس کر سکتے ہیں ——— ان اشعار میں جو چیز متوجہ کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ ان میں جو اقدار و افکار ہیں وہ محض زندگی کا رزمیہ ہی نہیں ہیں بلکہ مضر اور منفی اندازِ حیات پر سوالیہ نشان بھی بناتے ہیں۔ زندگی کی ستم رانیوں پر زہر خند بھی ہیں۔ اور زہریلی دھوپ میں انسان کے لیے شجرِ سایہ دار کا حکم بھی رکھتے ہیں۔ ان افکار و اقدار اور اندازِ بیان میں ایک نوع کی قوتِ شفا ہے، جو اپنی جگہ بڑی چیز ہے۔

اردو شاعری میں، ترقی پسندی کے بعد دوسرا طاقت ور رجحان جدیدیت کے نام سے ابھرا۔ جدیدیت کے چند علم برداروں نے اس فطری رجحان کو اپنے بعض مقاصد کے تحت ایک خاص سمت و جہت دینے کی کوشش کی ہے۔ اور اس فلسفہ طرازی میں۔ جو غلطی ترقی پسندوں نے کی تھی وہی جدیدیت کے علم برداروں نے کی ہے۔ ترقی پسندوں پر یہ اعتراض تھا کہ وہ ادب کی تخلیق ایک خاص نظریے کے تحت کرتے ہیں، اور اس کے نتیجہ میں ادب پر نظریہ کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ ادبی اور جمالیاتی اقدار پر کاری ضرب لگتی ہے اور وہ مجروح ہو جاتی ہیں۔ لیکن خود جدیدیت کے بعض علم برداروں نے یہی طریقۂ کار اپنایا ہے۔ انھوں نے ترقی پسندی کے بالکل متضاد اور مخالف فلسفہ تراش لیا۔ جس میں باور کرایا گیا کہ زندگی کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ قدروں کا زوال ہو چکا ہے۔ انسان تنہائی اور تشکیک کا شکار ہو چکا ہے۔ زندگی مہمل بلکہ لغو ہے۔ اس لیے ادب اور شاعری کو بھی لغو اور مہمل ہونا چاہیئے یا کم سے کم اس کا کوئی منصب اور مقصد نہیں ہے۔ چونکہ زندگی خود ناقابلِ فہم ہے۔ اس لیے ادب اور شاعری کو بھی ناقابلِ فہم ہونا چاہیے۔ اور یہ کہ سچا ادب ترسیل کے المیہ کا شکار ہوتا ہے۔ لیکن جدیدیت نے جو مثبت کام کیا ہے وہ ایک طرف کلاسیکی اصولوں کو لچک دار بنانے کا ہے۔ اور دوسری طرف ترقی پسندی کی نظریاتی آمریت سے ادب کو نجات دلانے کا ہے۔ جدید شاعروں نے موضوعات کی سطح پر شاعری کا دائرہ وسیع کیا ہے۔ انھوں نے زندگی کے ہر منظر اور ہر مظہر کو شاعری کا محور اور مرکز قرار دیا ہے۔ انسان کی سائیکی اور اس کی داخلی زندگی کے ہنگاموں اور کیفیتوں کو خاص طور پر شاعری کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ جدیدیت نے غزل کے اسلوب کو خاص طور پر متاثر کیا ہے۔ اور پیکر تراشی، علامت نگاری اور استعارہ سازی کے رجحان کو تقویت دی ہے۔ غرض غزل کے اسلوب میں وضاحت پر رمزیت کو فوقیت دی اور جمالیاتی اقدار پر از سرِ نو ایمان تازہ کیا۔ دہلی کے شاعروں کی غزلوں میں جدیدیت کے بعض مثبت اثرات ملتے ہیں مثلاً

ہر گھڑی رہتا ہے اب خدشا مجھے
پی نہ جائے وقت کا دریا مجھے
(اجمل اجملی)

ٹوٹتے رشتوں کا آئینہ عجب ہو جائے گا
ایک دن انسان بے نام ونسب ہو جائے گا
(امیر قزلباش)

کیا دل خراش کام ہوا ہے، مرے سپرد
اک زرد رُت کے برگ وثمر چن رہا ہوں میں
(باقی)

اندھے پانی سے بھی نیچے کا بسیرا ہوں میں
تجھ سمندر کا، گھٹاٹوپ اندھیرا ہوں میں
(من موہن تلخ)

اپنے سوا تھا کون میں دیتا کسے شراپ
اپنے ہی سر پہ ہاتھ رکھا اور مر گیا
(کمار پاشی)

بچھڑا ہر ایک فرد بھرے خاندان کا
مجھ کو شراپ لگ گیا کس بے زبان کا
(صادق)

کوئی گھر، اس شہر میں بے سائباں دیکھا نہیں
میرا گھر کیوں رہ گیا بے سائباں میں کون ہوں
(مخمور سعیدی)

ہم زادئت آئینہ دکھاتا ہے کہ میں ہوں
پھر کوئی لہو میں اتر آتا ہے کہ میں ہوں
(مظفر حنفی)

ان اشعار میں وقت کے دریا کے پی جانے کا خدشہ، ٹوٹتے رشتوں کے آئینہ خانے میں انسان کے بے نام و نسب ہو جانے کا احساس کرنا، زرد رُت کے برگ و ثمر چھننے کا دل خراش کام کرنا، خود کو اندھے پانی کی نچلی تہ کا خوفناک جزیرا تصوّر کرنا، خود کو مجسمۂ سر کی طرح سر پہ ہاتھ رکھ کر شراپ دینا، بھرے خاندان کے بچھڑنے پر کسی بے زبان کے شراپ لگنے کا احساس کرنا، بھرے شہر میں اپنے گھر کو بے سائباں تصوّر کرنا، ہم زاد کا تت آئینہ دکھانا، محض نری استعارہ سازی یا پیکر تراشی نہیں۔ بلکہ مجازی زبان کی ان شکلوں میں شاعروں نے اپنے تخلیقی تجربوں کو مجسم کیا ہے۔ اور اس دور کے انسان کی خوف زدگی، بے چارگی، اور آشوبِ آگہی کا فنکارانہ اظہار ہے۔
دہلی کے شاعروں نے جدید رجحان کو قبول کرنے میں اپنی گہری بصیرت اور فنّی شعور کا ثبوت دیا ہے۔ ایک طرف انھوں نے کلاسیکی اصولوں کا جائز حد تک احترام کیا ہے اور دوسری طرف اظہار کے نئے وسیلوں کو اپنایا ہے۔ استعاروں، اور تشبیہوں کی ندرت نیز پیکروں کی لطافت اسی بات کا ثبوت ہے۔ لیکن انھوں نے استعارہ سازی اور پیکر تراشی یا علامت نگاری میں اس نکتہ کو فراموش نہیں کیا ہے کہ غزل میں ہر لفظ، ترکیب اور مجازی زبان کی شکل کو جمالیاتی اور تخلیقی فضا آفرینی کا کام کرنا ہے۔ اور اس کو اپنی جگہ مقصود بالذات نہیں بلکہ اظہار کا بہترین وسیلہ ہونا ہے۔ دہلی کے شاعروں نے معنویت کی سطح پر محض اہم تبدیلیوں کو انگیز کیا ہے۔ اور غزل کو نئے انسان کی پیچیدہ سائیکی کا جمالیاتی پیکر بنایا ہے۔ اور اس میں انسان کے نادر، نایاب اور مُبہم جذبوں کو بحد دل نوازی اور چابک دستی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس لیے دہلی کے شاعروں کی غزل نئی غزل ہوتے ہوئے ایک طرف پرانی غزل کی توسیع ہے۔ اور دوسری طرف اس کی زندہ روایات کی از سرِ نو تخلیق بھی ہے۔ جو اپنی جگہ بہت اہم کارنامہ ہے۔

دہلی ایک عظیم مرکزی شہر ہے۔ اس کے دروازے چاروں طرف کو کھلتے ہیں۔ اس کا رشتہ ملک اور بیرونِ ملک کے ہر شہر، قریے اور گوشے سے ہے۔ اس لیے دہلی والوں کے ذہن اور دل کے دریچے تازہ ہواؤں کے لیے وا رہتے ہیں۔ اور وہ ہر لطیف جھونکے کا خیر مقدم کرتے

ہیں، جس کا اثر یہاں کی تہذیبی اور ادبی زندگی بھی قبول کرتی ہے۔ دہلی نے قدما کے دور میں دبستانِ شاعری کی حیثیت سے اپنا جو پرچم لہرایا تھا۔ اس کی عظمت اور شعریت کا بھرم آج تک رکھا ہے۔ اس کام میں دہلی کے شاعروں نے ایک طرف کلاسیکی زندہ اور تابندہ روایات کو برقرار رکھا، اور دوسری طرف ادب وشعر کے نئے میلانات اور رجحانات کو اپنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی کے بعد اردو غزل کے میدان میں ایک طرف کلاسیکی اور نو کلاسیکی دبستاں اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ اگر اس ذخیرے سے خالص روایتی عناصر کو منہا کر دیا جائے تو کلاسیکی اور نو کلاسیکی غزل کا ایک وافر ذخیرہ باقی رہتا ہے۔ جو اپنی جگہ نوک پلک سے درست، صحتِ زبان وبیان کا شاہ کار اور عروضی وفنی چابک دستی، مہذب رومانیت اور صحت مند روایات کا آئینہ دار ہے۔ اسی دبستان کے جلو میں زندگی کے سنجیدہ اور گمبھیر افکار واقدار کا نگار خانہ جگمگا رہا ہے۔ اس رجحان کے تحت تصوف، ویدانت، فلسفیانہ افکار، دیو مالائی اثرات اور زندگی کے اعلیٰ سطح کے تجربوں کا اثر نمایاں ہے۔ آزادی کے بعد اس رجحان کو زندگی کے نشیب وفراز اور برق رفتاری سے تقویت ملی ہے۔ اس دور میں زندگی کے افق کا عجیب عالم ہے۔ سیکڑوں رنگ ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے گزر رہے ہیں۔ اس لیے زندگی کے سچے اور اچھے رنگوں نے اپنے وجود پر جس انداز دل ربائی اور توانائی سے اصرار کیا ہے، وہ اس رجحان کی اہم خصوصیت ہے، اس رجحان کے علم برداروں نے ایک طرف زندگی کے خارجی ہنگاموں کی طرف معنی خیز اشارے کیے ہیں۔ اور دوسری طرف اُن کے باطنی اثرات کی مثبت انداز میں تجسیم کی ہے۔ انسان کے تقدس، زندگی کی عظمت، اخلاق، روحانیت اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں کا رمز بڑھا ہے۔ یہ رجحان بہت دیرپا اثرات کا حامل ہے ــــ آزادی کے بعد، دہلی کی اردو غزل نے ترقی پسند افکار کا خیر مقدم کیا ہے۔ اگرچہ پہلے سے اردو غزل میں رجائیت، کس بل اور زندگی سے قربت کا احساس کارفرما تھا۔ لیکن ترقی پسند عناصر نے ان کو اور تازہ وتابندہ کر دیا۔ کلاسیکی اور نو کلاسیکی غزل کے ساتھ جدید غزل میں بھی ان اثرات کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ ترقی پسند غزل نے کلاسیکی غزل کی نسبتاً گھٹی ہوئی فضا کو کشادگی سے آشنا کیا۔ اور غزل کے سانچے میں لچک اظہار میں ترسیلی عناصر، اور معنویت کی سطح پر زندگی کی

اعلیٰ اقدار کا اضافہ کیا۔ اسی طرح جدیدیت کے رجحان نے غزل کو نظریاتی جبر سے آزاد کر کے اس کو آزاد فضا میں سانس لینے کا موقع فراہم کیا۔ غزل کو وضاحتی اسلوب سے نجات دلاکر از سرِ نو جمالیاتی اقدار اور موضوعات کے وسیع کینوس تک پہنچایا۔ جدید غزل نے استعارہ سازی، علامت نگاری اور پیکر تراشی کے رجحان کو تقویت عطا کی۔ نیز انسان کے خارجی ماحول سے زیادہ اس کے ذہن وضمیر کی داخلی فضا، انسان کی پیچیدہ سائیکی اور وجدان کے تجربے کے اظہار کا وسیلہ بنایا —— اقدار کی شکست وریخت، انسان کی ذہنی اور جذباتی تنہائی اور آشوبِ آگہی کو زیادہ موثر اور دلکش انداز میں پیش کیا۔ ان بڑے رجحانات کے علاوہ اور بہت سے رجحانات بھی نظر آتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ہر شاعر اگر وہ سچا شاعر ہے تو اپنی جگہ خود انفرادیت پسند ہوتا ہے۔ اور اپنا اور اپنی شاعری کا ایک آزاد وجود رکھتا ہے۔ جس کی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں۔ دہلی کے اردو شاعروں میں بعض شاعر اس منصب پر بھی فائز ہیں۔ جن کی مکمل شناخت کرنا تحقیق کا کام ہے۔

اس جائزے کی بنیاد پر کیا جا سکتا ہے کہ 'دبستانِ دہلی' کا وجود اپنی جگہ باقی ہے۔ اگرچہ اس کی پرانی خصوصیات میں مرورِ زمانہ کے ساتھ تبدیلیاں آگئی ہیں مگر ان کی اپنی خوشبو اور اپنا ذائقہ ہے۔ آزادی کے بعد خاص طور پر ہماری سماجی تہذیبی، سیاسی اور اقتصادی زندگی میں جو تیز رفتار تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی ادبی تحریکات کے جو سائے پڑے ہیں، اردو غزل نے ان کو اپنے مزاج کے مطابق قبول کیا ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اردو غزل کسی ٹھہرے ہوئے تالاب کا پانی نہیں بلکہ ایک بہتا ہوا دریا ہے۔ اور دریا کے سفر میں پہاڑی ندی کی چھل بل بھی ہے۔ اور میدانی دریا کا سنجیدہ خرام بھی۔ مجھے یقین ہے کہ مستقبل میں بھی اردو غزل زندگی اور زمانے کے اثرات کو قبول کرتی اور ان کو جمالیاتی پیکر عطا کرتی رہے گی۔

دہلی میں غزل کے شاعروں کی کثیر تعداد موجود ہے۔ اور "جو ذرّہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے" کے مصداق ہر شاعر اپنی جگہ اہم ہے، ظاہر ہے کہ تمام شاعروں کو اس انتخاب میں شامل کرنا ممکن نہیں ہے۔ اسی لیے ایک طرف انتخاب در انتخاب کے اصول پر عمل کرنا پڑا۔ اور دوسری طرف دہلی کے شاعروں

کی خاص تعداد کو نمایندگی دینے کا اصول بھی مد نظر رکھا۔ اس لیے اس انتخاب کے پس پردہ معیار اور نمایندگی دونوں محرکات کارفرما ہیں۔ میں نے بعض شاعروں کو بار بار خطوط لکھے، ان سے ملاقات کی، لیکن وہ اجازت نامہ عطا کرنے اور تعاون کرنے میں خوبصورت بہانے تراشتے رہے۔ اس لیے اس انتخاب میں ایسے شاعروں کا کلام شامل نہیں ہے۔ اس انتخاب میں بعض اشعار فنّی نقطۂ نظر سے محلِ نظر ہیں۔ میں ان مقامات سے متفق نہیں ہوں۔

آزادی کے بعد دہلی میں اردو غزل کا ایک مختصر منظر نامہ آپ کے سامنے ہے ــــــ جس میں حروفِ تہجی کے اعتبار سے شاعروں کے اسمائے گرامی اور ان کی غزلوں کو پیش کیا گیا ہے۔

میں ان تمام شاعروں کا شکریہ ادا کرنا اپنا اخلاقی فرض تصور کرتا ہوں، جنھوں نے مجھے اپنے کلام کی اشاعت کا خوش دلی سے اختیار دیا ہے۔ مرحوم شاعروں کے ان اعزا کا شکر گزار بھی ہوں، جنھوں نے اپنے متعلقین کے کلام کی شمولیت کی اجازت دی ہے۔ میں چند اور شاعروں کا کلام شامل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن انھوں نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ ان کی عدم توجہی کا بھی ممنون ہوں۔ جناب اندر سروپ دت نادان، عزیزی صالح حبد اللہ، اور عزیزی مولوی نعیم الدین رضوی، کا ممنون ہوں کہ ان حضرات نے بعض مرحوم شاعروں کے اعزا سے اجازت نامے حاصل کرنے میں میری مدد کی ہے۔ جناب سید شریف الحسن نقوی اور ڈاکٹر انتظار مرزا کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ موصوف نے اپنی نگرانی میں اس کتاب کو اشاعت و طباعت کے ہر مرحلے میں اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ اور جناب وکیل الرحمٰن ملک، کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے بروقت کتابت کے فرائض انجام دیے۔

جمعہ۔ ۱۷ر فروری ۱۹۸۹ء

عنوان چشتی

(عنوان چشتی)

بی ۱۱۷، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵-۱۱۰۰

اجمل اجملی

(۱)

ہر گھڑی رہتا ہے اب خدشا مجھے
پی نہ جائے وقت کا دریا مجھے

گو حقیقت تھا، مگر اے زندگی
خواب سا تونے سدا دیکھا مجھے

جب بھی ملتا ہوں وہی چہرہ لیے
بد دعا دیتا ہے آئینا مجھے

چھوڑ آیا ہوں سلگتی ریت میں
جانے کیا کہتا ہو نقشِ پا مجھے

اس کے دل میں خود وفا ناپید تھی
دوستی کی بھیک کیا دیتا مجھے

ڈوبتی بجھتی ہوئی آواز ہوں
ساتھ والو غور سے سننا مجھے

(۲)

یادِ فراقِ یار ترا شکریہ بہت
کل رات دل میں درد ہمارے اٹھا بہت

کل رات تیرے غم نے لگائی تھی چھبیل
کل رات ہم نے زہر ہلاہل پیا بہت

مدّت کے بعد دل سے ملاقات ہوگئی
ہم کو اداس دیکھ کے رویا کیا بہت

شاید نسیم تیرا بدن چھو کے آئی تھی
اپنی سحر میں رنگِ قیامت رہا بہت

انجمؔ نہ آپ سا بھی کوئی سخت جاں ملا
دیکھیں ہیں ہم نے یوں تو ستم آشنا بہت

(۲)

شہر شہر ڈھونڈ آئے در بدر پکار آئے
سینہ چاک نکلے تھے اور دل فگار آئے

ہم کہ تھے تہی دامن دوست اور کیا کرتے
زندگی سی دلکش شے تیرے غم میں ہار آئے

تیرے در سے غم لے کر جب گناہگار اُٹھے
میکدوں کا کیا کہنا مسجدیں سنوار آئے

لغزشوں سے وابستہ لغزشیں قیامت کی
رات کچھ عجب دھن میں تیرے بادہ خوار آئے

دوستو بس اس لمحہ ہم کو یاد کر لینا
جب کبھی گلستاں میں موسمِ بہار آئے

۴

وقتِ سفر قریب ہے بستر سمیٹ لوں
بکھرا ہوا حیات کا دفتر سمیٹ لوں

پھر جانے ہم ملیں نہ ملیں اک ذرا رکو
میں دل کے آئینے میں یہ منظر سمیٹ لوں

یاروں نے جو سلوک کیا اس کا کیا گلا
پھینکے ہیں دوستوں نے جو پتھر سمیٹ لوں

کل جانے کیسے ہوں گے کہاں ہوں گے گھر کے لوگ
آنکھوں میں ایک بار بھرا گھر سمیٹ لوں

تارِ نظر بھی غم کی تمازت سے خشک ہے
وہ پیاس ہے، ملے تو سمندر سمیٹ لوں

اجمل بھڑک رہی ہے زمانے میں جلتی آگ
جی چاہتا ہے سینے کے اندر سمیٹ لوں

(۵)

راستے کے پیچ و خم کیا شے ہیں سوچا ہی نہیں
ہم سفر پر جب سے نکلے مڑ کے دیکھا ہی نہیں
دو گھڑی رک کر ٹھہر کر سوچتے منزل کی بات
راستے میں کوئی ایسا موڑ آیا ہی نہیں
زندگی کے ساتھ ہم نکلے تھے لے کر کتنے خواب
زندگی بھی ختم ہے موسم بدلتا ہی نہیں
اک دیا یادوں کا تھا روشن تھی جس سے بزمِ شب
جانے کیا گزری کئی راتوں سے جلتا ہی نہیں
زندگی بھر پے بہ پے ہم نے کریدے اپنے زخم
ہم سے چھٹ کر اُس پہ کیا گزری یہ سوچا ہی نہیں
آرزو تھی کھینچتے ہم بھی کوئی عکسِ حیات
کیا کریں اب کے لہو آنکھوں سے ٹپکا ہی نہیں
اس طرح کیسے ہو اجملؔ چارۂ دل کی اُمید
درد اپنا آخری حد سے گزرتا ہی نہیں

اختر: ہری چند اختر

(۱)

شباب آیا کسی بُت پر فدا ہونے کا وقت آیا
مری دنیا میں بندے کے خدا ہونے کا وقت آیا

انھیں دیکھا تو زاہد نے کہا ایمان کی یہ ہے
کہ اب انسان کو سجدہ روا ہونے کا وقت آیا

خُدا جانے یہ ہے اَوجِ یقیں یا پستیٔ ہمّت
خُدا سے کہہ رہا ہوں نا خدا ہونے کا وقت آیا

ہمیں بھی آپڑا ہے دوستوں سے کام کچھ، یعنی
ہمارے دوستوں کے بے وفا ہونے کا وقت آیا

نویدِ سربلندی دی منجّم نے تو میں سمجھا
سگانِ دہر کے آگے دوتا ہونے کا وقت آیا

(۲)

جس زمیں پر ترا نقشِ کفِ پا ہوتا ہے
ایک اک ذرّہ وہاں قبلہ نما ہوتا ہے

کاش وہ دل پہ رکھے ہاتھ اور اتنا پوچھے
کیوں تڑپ اٹھتا ہے، کیا بات ہے، کیا ہوتا ہے

بزمِ دشمن ہے خدا کے لیے آرام سے بیٹھ
بار بار اے دلِ ناداں تجھے کیا ہوتا ہے

میری صورت، مری حالت، مری رنگت دیکھی
آپ نے دیکھ لیا عشق میں کیا ہوتا ہے

اے صبا! خارِ مغیلاں کو سنا دے مژدہ
عازمِ دشت کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

ہم جو کہتے ہیں ہمیشہ ہی غلط کہتے ہیں
آپ کا حکم درست اور بجا ہوتا ہے

(۴)

سنا کر حال، قسمت آزما کر لوٹ آئے ہیں
انھیں کچھ اور بیگانہ بنا کر لوٹ آئے ہیں

پھر اک ٹوٹا ہوا رشتہ، پھر اک اجڑی ہوئی دنیا
پھر اک دلچسپ افسانہ سنا کر لوٹ آئے ہیں

فریبِ آرزو اب تو نہ دے اے مرگِ مایوسی
ہم امیدوں کی اک دنیا لٹا کر لوٹ آئے ہیں

خدا شاہد ہے اب تو ان سا بھی کوئی نہیں ملتا
بزعمِ خویش ان کو آزما کر لوٹ آئے ہیں

بچھے جاتے ہیں یا رب کیوں کسی کافر کے قدموں میں
وہ سجدے جو درِ کعبہ پہ جا کر لوٹ آئے ہیں

Dr. ZAKIR HUSAIN LIBRARY
120432
27.12.89

(۴)

سیرِ دنیا سے غرض تھی محوِ دنیا کر دیا
میں نے کیا چاہا مرے اللہ نے کیا کر دیا

روکنے والا نہ تھا کوئی خدا کو، اس لیے
جو کچھ آیا اس کے جی میں بے محابا کر دیا

ہاں اِسی کم بخت دل نے کر دیا افشائے راز
ہاں اِسی کم بخت دل نے مجھ کو رُسوا کر دیا

عشق جا، اِن تیری باتوں میں نہیں آنے کے ہم
اچھے اچھوں کو جہاں میں تو نے رُسوا کر دیا

زندگی بیٹھی تھی اپنے حُسن پر بھولی ہوئی
موت نے آتے ہی سارا رنگ پھیکا کر دیا

حُسن کی پہلے تو سب مجھ پر حقیقت کھول دی
اور پھر خاموش رہنے کا اشارا کر دیا

حُسن کو پہنا چکے جب خود نمائی کا لباس
عِشق نے سر پیٹ کر پوچھا کہ یہ کیا کر دیا

(۵)

اُمیدوں سے دلِ برباد کو آباد کرتا ہوں
مٹانے کے لیے دُنیا نئی ایجاد کرتا ہوں

تری میعادِ غم پوری ہوئی اے زندگی خوش ہو
قفس ٹوٹے نہ ٹوٹے میں تجھے آزاد کرتا ہوں

جفا کارو مری مظلوم خاموشی پہ ہنستے ہو
ذرا ٹھہرو ذرا دم لو ابھی فریاد کرتا ہوں

میں اپنے دل کا مالک ہوں مرا دل ایک بستی ہے
کبھی آباد کرتا ہوں، کبھی برباد کرتا ہوں

مُلاقاتیں بھی ہوتی ہیں مُلاقاتوں کے بعد اکثر
وہ مجھ کو بھول جاتے ہیں میں اُن کو یاد کرتا ہوں

آزاد جگن ناتھ آزاد

(۱)

مری عمرِ رواں ہے اور میں ہوں
یہ جنسِ رائگاں ہے اور میں ہوں
تصور میں بہاریں ہیں گُل افشاں
نگاہوں میں خزاں ہے اور میں ہوں
ذرا آواز دے اے دورِ ماضی
ترا دردِ نہاں ہے اور میں ہوں
کہوں کس سے کہ اس دورِ نوا میں
فقط میری فغاں ہے اور میں ہوں
مری تقدیر کانٹے چُن رہی ہے
بہارِ بوستاں ہے اور میں ہوں
مرے نغمات پر خوش ہونے والے
مرا سوزِ نہاں ہے اور میں ہوں
ترستی ہیں خریداروں کو نظریں
لبِ گوہر فشاں ہے اور میں ہوں
میں اپنے آپ کو گُم کر چکا کیا
یہ احساسِ زیاں ہے اور میں ہوں
مرے اشعار کی روداد آزاد!
مرا خونِ رواں ہے اور میں ہوں

(۲)

اپنی آنکھوں میں عجب اک گھر لیے پھرتا ہوں میں
ہاتھ میں بنیاد کا پتھر لیے پھرتا ہوں میں
تبصرہ کیا چاہتے ہو آج کے حالات پر
آج سر اپنا ہتھیلی پر لیے پھرتا ہوں میں
ان میں کچھ پیکر ہیں خوابیدہ تمھاری طرح کے
یہ جو اپنے ہاتھ میں پتھر لیے پھرتا ہوں میں
اُن کا خنجر مجھ کو یارو! کس قدر محبوب تھا
اُن کے خنجر کا نشاں سر پر لیے پھرتا ہوں میں
جن کے جلوے لوٹ کر واپس نہ آئیں گے کبھی
یوں نگاہوں میں وہ بام و در لیے پھرتا ہوں میں
انتہا خواہش کی اب تسخیر بحر و بر نہیں
اب نگاہوں میں مہ و اختر لیے پھرتا ہوں میں
فن کی ناقدری پہ اے آزاد! یوں دل ہے اداس
جیسے سچ مچ کوئی گوہر لیے پھرتا ہوں میں

(۳)

یہ بھی کم تھا گرچہ تیری ذات سے پایا بہت
تو ہوا رخصت تو دل کو یہ خیال آیا بہت

سیم و زر کیا شے ہے یہ لعل و گہر کیا چیز ہیں
آنکھ بینا ہو تو علم و فن کا سرمایا بہت

کیا خبر کیا بات اُس کے کفر میں پوشیدہ تھی
ایک کافر کیوں حرم والوں کو یاد آیا بہت

گھر سے اک ویرانیٔ دل لے کے نکلا تھا مگر
کارواں یادوں کے میں دل میں بسا لایا بہت

دَیر ہی کی روشنی میرے لیے کافی نہ تھی
میں حرم کا نُور بھی دل میں بسا لایا بہت

اُس جگہ کھونے کا پانے کا عجب مفہوم ہے
ہم نے آکر جس جگہ کھویا بہت پایا بہت

ابتدا یہ تھی کہ میں تھا اور دعوئٰ علم کا
انتہا یہ تھی کہ اِس دعوے پہ شرمایا بہت

ہائے وُہ ہر لحہ تجھ کو دیکھنے کی آرزو
دل مگر اُس آرزو پر آج پچھتایا بہت

یوں تو اے آزاد! تیرے شعر کے سو رنگ ہیں
مجھ کو لیکن یہ ترا لہجہ پسند آیا بہت

(۴)

کس متاعِ شوق کی ہم جستجو کرتے رہے
زندگی بھر زندگی کی جستجو کرتے رہے
جب حریفوں کی زباں تھی شعلہ گفتاری میں غرق
ہم تغزّل کی زباں میں گفتگو کرتے رہے
اور ہوں گے جن کو ہو گا چاک دامانی پہ ناز
ہم جنوں میں چاکِ داماں کو رفو کرتے رہے
اصل میں ہم تھے تمھارے ساتھ محوِ گفتگو
جب خود اپنے آپ سے ہم گفتگو کرتے رہے
اے خرد مندو! جنوں سے جب کہ ناواقف تھے تم
سوچتا ہوں کس طرح تم ہائے و ہو کرتے رہے
ان کو اب نفع و ضرر کی بات کیا سمجھائیں ہم
وہ جو سودائے متاعِ آبرو کرتے رہے
پینے والوں کا جب اوروں کے لہو پر تھا مدار
ہم شریکِ جام اپنا ہی لہو کرتے رہے
گوہرِ مقصد نہ پایا گرچہ ہم اس کی تلاش
یم بہ یم، دریا بہ دریا، جو بجو کرتے رہے
کوئی یہ آزاد سے پوچھے کہ اپنے دل سے دور
تم کہاں جا کر تلاشِ رنگ و بو کرتے رہے

۵

فکر و فن کا یوں تو ٹھاٹھیں مارتا دریا ہوں میں
کون لیکن اس کو دیکھے کس قدر پیاسا ہوں میں

کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا ہے آخر کیا ہوں میں
میں کسی جلوے کا پردا ہوں کہ خود جلوا ہوں میں

جس طرح ایک اعترافِ جُرم کی تصویر ہو
اس طرح خاموش تیرے روبرو بیٹھا ہوں میں

یہ نہیں ہے دوپہر یا شام کے سائے کی بات
اپنے سائے سے بہر صورت بہت چھوٹا ہوں میں

جس چمن کا تنکا تنکا تم اڑا کر لے گئیں
اے ہواؤ اُس چمن کا آخری تنکا ہوں میں

تم کہ میری محفل آرائی سے دھوکا کھا گئے
کس طرح تم کو بتاؤں کس قدر تنہا ہوں میں

ہم کلام آزاد! مجھ سے اب یہ منظر ہو نہ ہو
صبح کے منظر کو اب بھی دیکھتا رہتا ہوں میں

اظہار اثر

(۱)

یہ داستاں ہے شہیدوں کی خوں چکیدہ ہے
قلم بھی دستِ مورّخ میں سر بریدہ ہے
حیات ایسی زلیخا کہ آج کا یوسف
گناہ گار ہے اور پیرہن دریدہ ہے
لہو جلاؤ چراغوں میں روشنی کے لیے
ہمارے دور کا سورج تو شب گزیدہ ہے
دبا دبا سا یہ طوفاں، گھٹی گھٹی ہلچل
ہواؤں میں کوئی پیغام نارسیدہ ہے
تمام مظہرِ فطرت ترے غزل خواں ہیں
یہ چاندنی بھی ترے جسم کا قصیدہ ہے
نہ بجھ سکے گی مری پیاس آنسوؤں سے اثرؔ
یہ ابر کیوں مری حالت پہ آبدیدہ ہے

(۲)

ایک ہی شے تھی بہ انداز دگر مانگی تھی
میں نے بینائی نہیں، تجھ سے نظر مانگی تھی
تو نے جھلسا دیا جلتا ہوا سورج دے کر
ہم نے جینے کے لیے ایک سحر مانگی تھی
ہم سفر کس کو کہیں، شمس و قمر نے ہم سے
منھ پہ ملنے کے لیے گردِ سفر مانگی تھی
کون آزر ہے جسے اپنا زیاں ہے مقصود
کس نے پتھر کے لیے روحِ بشر مانگی تھی
ایک لمحہ کوئی جی لے تو بڑی بات ہے یہ
اس لیے ہم نے اثرِ عمرِ شرر مانگی تھی

(۳)

سو فارِ تصوّر ہے ستاروں کا ہدف ہے
ہے فاتحِ افلاک یہ انساں کا شرف ہے
اک لمحۂ تخلیق کی آہٹ ہے کہیں پر
موتی کوئی نکلے گا ابھی بندِ صدف ہے
تو بھی تو ہٹا جسم کے سورج سے اندھیرے
یہ مہکی ہوئی رات بھی مہتاب بکف ہے
جس لفظ پہ سر اپنے کٹائے شہداء نے
تاریخِ سیاست سے وہی لفظ حذف ہے
ہر سمت فرشتے ہیں کہ ترشے ہوئے پتھر
اس بھیڑ میں انساں کے لیے بھی کوئی صف ہے

(۴)

نکھرے تو جگمگا اٹھے، بکھرے تو رنگ ہے
سورج ترے بدن کا بڑا شوخ و شنگ ہے
تاریکیوں کے پار چمکتی ہے کوئی شے
شاید مرے جنونِ سفر کی امنگ ہے
کتنے غموں کا بار اٹھائے ہوئے ہے دل
اک زاویہ سے شیشۂ نازک بھی سنگ ہے
صحرا کی گود میں بھی ملیں گے بہت سے پھول
یہ اپنے اپنے طور پہ جینے کا ڈھنگ ہے
شاید جنوں ہی اب تو کرے رہبری اثر
ہم اس مقام پر ہیں جہاں عقل دنگ ہے

۵

ایک سورج کا کیا ذکر ہے کہکشائیں چلیں
میں چلا تو مرے ساتھ ساری دشائیں چلیں

آگے آگے جنوں تھا مرا گرد اڑاتا ہوا
پیچھے پیچھے مرے آندھیوں کی بلائیں چلیں

کوئی زنجیر ٹوٹی تھی یا دل کی آواز تھی
دائرے سے بنائی ہوئی کیوں صدائیں چلیں

میں چلا تو ہر اک چیز ٹھہری ہوئی سی لگی
میں رکا تو یہ دھرتی چلی یہ فضائیں چلیں

اک شہادت نما تشنگی تھی مقدّر مرا
میں جدھر بھی گیا ساتھ میں کربلائیں چلیں

جانے کس کے رسیلے لبوں کی مہک لائی تھیں
زخم آواز دینے لگے جب ہوائیں چلیں

ان سے ملنے کا منظر بھی دلچسپ تھا اے اثر
اس طرف سے بہاریں چلیں اور ادھر سے خزائیں چلیں

افضل پشاوری

(۱)

گوارا لطف فرمانے کی زحمت کون کرتا ہے
محبّت کرنے والے سے محبت کون کرتا ہے
کبھی آئینہ لے کر حُسن سے اپنے زرا پوچھو
نظر کو دل کو پا بندِ محبّت کون کرتا ہے
محبّت تم بھی کرتے ہو، محبّت میں بھی کرتا ہوں
مگر دونوں میں مُنھ دیکھی محبت کون کرتا ہے
جوانی کے نکھرتے حُسن کے آزار سے پوچھو
مرے خوابیدہ جذبوں سے شرارت کون کرتا ہے
غرض مندی تک اے افضل محبّت سب کو ہے لیکن
محبّت آج کل حسبِ محبّت کون کرتا ہے

۲

کیا خبر تھی ناگہاں تم بدگماں ہو جاؤ گے
اور نگاہِ شوق کی حد تک نہاں ہو جاؤ گے
تم سے تو مجھ کو کبھی ایسی توقع ہی نہ تھی
مہرباں ہوتے ہوئے نامہرباں ہو جاؤ گے
ابتدائی منزلوں میں چھوڑ دو گے ساتھ تم
اور ہمیشہ کے لیے دامن کشاں ہو جاؤ گے
ہوگا ایسا بھی تغیّر یہ کیسے معلوم تھا
بن کے تم آرامِ جاں ، آلامِ جاں ہو جاؤ گے
اس قدر ہو جائے گی دوری یقیں مجھ کو نہ تھا
رفتہ رفتہ تم مرے وہم و گماں ہو جاؤ گے

امن لکھنوی، منشی گوپی ناتھ

(۱)

شوقِ ثواب کچھ نہیں خوفِ عذاب کچھ نہیں
جس میں نہ جوشِ جہد ہو، اس کا شباب کچھ نہیں
زندگی اک سوال ہے جس کا جواب موت ہے
موت بھی اک سوال ہے جس کا جواب کچھ نہیں
نغمۂ نو کے واسطے غیر کی احتیاج کیا
چھیڑ دے تارِ سازِ دل چنگ و رباب کچھ نہیں
صاف دلوں کے واسطے تنگ ہے عرصۂ حیات
ذاتِ حباب خوب ہے عمرِ حباب کچھ نہیں
برہمن اور شیخ میں جھگڑے یہی ہیں رات دن
تیری کتاب کچھ نہیں، تیری کتاب کچھ نہیں
رات کو میکدے میں کل تھی کسی مست کی صدا
ایک نظر کا رنگ ہے رنگِ شراب کچھ نہیں

(۲)

آمیدیں تو وابستہ ہیں ابرِ تر سے
جو برسے تو برسے نہ برسے نہ برسے
جہاں کیا ہے اور اِس کی رنگینیاں کیا
یہ پوچھو کسی دیدۂ حق نگر سے
زبان و دَہن سے جو کُھلتے نہیں ہیں
وہ کُھل جاتے ہیں راز اکثر نظر سے
مرا راستہ کارواں سے الگ ہے
گزرتا ہے اِک منزلِ پُر خطر سے
یہ ہے آمن انساں کی پستی سی پستی
گنہ سے بچا بھی تو دوزخ کے ڈر سے

(۲)

کوئی حد بھی ہے آخر امتحاں کی
الٰہی خیر قلبِ ناتواں کی

یہ ہے اِک مُہر بے بال وپری پر
رہائی بھی رہائی ہے کہاں کی

خزاں کا وسوسہ ہے فصلِ گل میں
ضرورت ہے بہارِ بے خزاں کی

زمیں پر ہیں وہ کچھ مٹی کے پُتلے
کہ جن میں رفعتیں ہیں آسماں کی

(۴)

یہ میکش کون باصد لغزشِ مستانہ آتا ہے
اشارے ہوتے ہیں وہ رونقِ میخانہ آتا ہے

تمھاری بزم بھی کیا بزم ہے آداب ہیں کیسے
وہی مقبول ہوتا ہے جو گستاخانہ آتا ہے

کہانی اپنی اپنی اہلِ محفل جب سناتے ہیں
مجھے بھی یاد اک بھولا ہوا افسانہ آتا ہے

دعا تیری ترے منتر بھلا مقبول کیا ہوں گے
بدی دل میں لیے سوئے عبادت خانہ آتا ہے

ہوائے تازہ، ابرِ تر، فزوں جوشِ نمو لیکن
نصیبِ دشمناں ہے کھیت میں جو دانہ آتا ہے

ہر اک ٹھوکر پہ ہے اے امن لغزش کا گماں مجھ کو
ہر اک پتھر نظر سنگِ درِ میخانہ آتا ہے

(۵)

کہا جھنجھلا کے اہلِ قافلہ سے ایک رہبر نے
ابھی تو پہلی منزل ہے ابھی سے کیوں لگے ڈرنے
مکمل داستاں کا اختصار اتنا ہی کافی ہے
سُلایا شورِ دنیا نے جگایا شورِ محشر نے
سرِ دیوارِ زنداں چاندنی چھنتی تھی پتوں سے
دیا تھا قید میں کیا لطف ایسی شب کے منظر نے
زمانہ کی کشاکش کا دیا پیہم پتہ مجھ کو
کہیں ٹوٹے ہوئے دل نے کہیں ٹوٹے ہوئے سر نے
ہیں کتنی مختلف باہم طبائع نسلِ انساں کی
رہے معذور اب تک جو چلے تھے تجزیے کرنے
فدائے رنگ و روغن سطح بیں سے کیا غرض اس کو
جگہ دی جس کو چشم و دل میں ہر اک اہلِ جوہر نے

نورؔ صابری

(۱)

تری مستی میں اُٹھ جاتی ہے جس جانب نظر ساقی
سوادِ شام کو ملتا ہے، پیغامِ سحر ساقی
یہ مانا تجھ سے کہنا ہے بہت کچھ قصۂ ماضی
گراں بارِ طبیعت ہو تو کردوں مختصر ساقی
اچٹتی ہی سہی، دل پر نظر کوئی تو پڑ جائے
خلش باقی رہے گی ورنہ دل میں عمر بھر ساقی
ازل سے آج تک جس کے لیے بیتاب ہیں نظریں
دکھا دے پھر وہی جلوہ بہ اندازِ دگر ساقی
بوصفِ حسن، اخلاص و وفا انورؔ کی بربادی
رہے گی حشر تک تصویرِ چشمِ نوحہ گر ساقی

(۲)

جو بادہ کش تری نظروں کی زد میں آگئے ساقی
وہ جانِ میکدہ بن کر، فضا پر چھا گئے ساقی

خزاں ابھی کہ جس میں زندگی یک سو تو رہتی ہے
بہارِ برق در دامن سے ہم گھبرا گئے ساقی

ہے ان رندوں کی جو یا چشم جامِ آتشیں اب تک
جو سوزِ دل سے شیشوں کا جگر گرما گئے ساقی

حدیثِ بزمِ نو کی اب زمانے کو ضرورت ہے
پرانی داستانوں سے بہت گھبرا گئے ساقی

ترے نقشِ قدم میں اب بھی وہ ذرّے ہیں خوابیدہ
جو خورشیدِ جہاں افروز کو شرما گئے ساقی

فرشتوں کا تخیّل بھی جنھیں اپنا نہیں سکتا
کچھ ایسے گیت بھی ہم بے خودی میں گا گئے ساقی

نگاہوں کی ڈھلی پیتے ہیں، جو وہ سب سے اچھے ہیں
جنابِ صابری یہ بات کیا فرما گئے ساقی

(۳)

وہ نیچی نگاہیں، وہ حیا یاد رہے گی
مل کر بھی نہ ملنے کی ادا یاد رہے گی
ممکن ہے مرے بعد بھلا دیں مجھے، لیکن
تا عمر انھیں میری وفا یاد رہے گی
جب میں ہی نہیں یاد رفیقانِ سفر کو
حیراں ہوں کہ منزل انھیں کیا یاد رہے گی
کچھ یاد رہے یا نہ رہے ذکرِ گلستاں
غنچوں کے چٹکنے کی صدا یاد رہے گی
محروم رہے، اہلِ قفس، نکہتِ گل سے
بیگانگیٔ موجِ صبا یاد رہے گی
پلکوں پہ لرزتے رہے آتور جو شبِ غم
مجھ کو انھیں تاروں کی ضیا یاد رہے گی

۴

وہ تصادمِ نگہِ حسین تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ نظر کی لغزشِ اولیں تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی موجِ کوثرِ گل فشاں کبھی برقِ شعلۂ بے اماں
وہ تبسمِ لبِ نازنیں تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

بصد احترام و بصد ادب، وہ سوالِ شوق بیک طلب
وہ ہزار بار نہیں نہیں تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ بہ احتیاط قدم قدم کسی خاص فکر کی الجھنیں
وہ کہیں خیال کہیں نظر تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جو تمھیں نہ اپنا بنا سکا، اسی نامراد کی لاش پر
وہ خمیدہ دامن و آستیں تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے عمر بھر یہ گماں رہا کہ نہ ہو سکوں گا کبھی جدا
وہ فریب خوردۂ صد یقیں تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے کہیے انورِ مبتلا وہ نظر شناسِ ادا ادا
وہی نکتہ رس وہی نکتہ چیں تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

انور صدیقی

١

عذابِ ہم سفری سے گریز تھا مجھ کو
پکارتا رہا اک ایک قافلہ مجھ کو
میں اپنی لوٹتی آواز کے حصار میں تھا
وہ لمحہ جب تری آواز نے چھوا مجھ کو
یہ کس نے چھین لیے مجھ سے خوشبوؤں کے مکاں
یہ کون دشت کی دیوار کر گیا مجھ کو
اجالتی نہیں اب مجھ کو کوئی تاریکی
سنوارتا نہیں اب کوئی حادثہ مجھ کو
بجھا بجھا سرِ محراب درد بیٹھا تھا
کوئی چراغ سمجھ کر جلا گیا مجھ کو
میں کیسے اپنے بکھرنے کا تجھ کو دوں الزام
زمانہ خود ہی بکھرتا ہوا ملا مجھ کو

۲

میری نظر کے لیے کوئی روایت نہ تھی
سب کی طرح دیکھنا جبر تھا عادت نہ تھی

ایسا لگا جیسے میں منظرِ مانوس تھا
اس کی نگاہوں میں کل شوخیِ حیرت نہ تھی

میرے شب و روز تھے میری صدی کی طرح
کون سا لمحہ تھا وہ جس میں قیامت نہ تھی

پیرہنِ جسم و جاں، زخمِ ستم تھا تمام
کیسا ستم گر تھا وہ کوئی جراحت نہ تھی

کب کسی دیوار سے سیلِ تمنا رُکا
گرم لہو کی کبھی کوئی شریعت نہ تھی

کتنے سبک دل ہوئے تجھ سے بچھڑنے کے بعد
ان سے بھی ملنا پڑا جن سے محبت نہ تھی

(۳)

ہجوم شعلہ میں تھا حلقۂ شرر میں تھا
کب اپنا خواب کوئی سایۂ شجر میں تھا
یں آج پھر تجھے کیا دیکھ پاؤں گا دنیا
وہ شخص دیر تلک آج پھر نظر میں تھا
سیہ فضاؤں میں اونچی اڑان سے پہلے
کرن کرن کا اجالا سا بال و پر میں تھا

(ق)

خنک فضاؤں میں اس دشتِ غم کے آنے تک
ہمارے ساتھ کوئی اور بھی سفر میں تھا
[illegible] شرر تھے جو لمحے حسین لگتے تھے
جو [illegible] لطف تھا بھی تو کچھ قربِ مختصر میں تھا
[illegible] کے ٹوٹ گئے ہم بکھرتی دنیا میں
خود آفرینی کا سودا ہمارے سر میں تھا

(٤)

ڈبوئے دیتا ہے خود آگہی کا بار مجھے
میں ڈھلتا نشہ ہوں موجِ طرب ابھار مجھے
اے روحِ عصر میں تیرا ہوں تیرا حصّہ ہوں
خود اپنا خواب سمجھ کر ذرا سنوار مجھے
بکھر کے سب میں عبث انتظار ہے اپنا
جلا کے خاک کر اے شمعِ انتظار مجھے
صدائے رفتہ سہی لوٹ کر میں آؤں گا
فرازِ خواب سے اے زندگی پکار مجھے
عذاب یہ ہے کہ مجھ جیسے پھول اور بھی ہیں
صلیبِ شاخ سے دستِ خزاں اتار مجھے
غریبِ شہر نوا ہی سہی، مگر یارو
بہت ہے اپنی ہی آواز کا دیار مجھے

۵

کیا شہر میں ہے گرمیِ بازار کے سوا
سب اجنبی ہیں ایک دلِ زار کے سوا

اس دشتِ بے خودی میں کہ دنیا کہیں جسے
غافل سبھی ہیں اک نگۂ یار کے سوا

چہروں کے چاند راکھ ہوئے بام بجھ گئے
کچھ بھی بچا نہ حسرتِ دیدار کے سوا

عالم تمام تیرگیِ دردِ مضمحل
ہاں اک فروغِ شعلۂ رخسار کے سوا

ساری شفق سمیٹ کے سورج چلا گیا
اب کیا رہا ہے موجِ شبِ تار کے سوا

جس سمت دیکھیے ہے صلیبوں کی اک قطار
کوئی افق نہیں افقِ دار کے سوا

امیر قزلباش

۱

میرے پیکر کی طرح تم بھی بکھر جاؤ گے
آئینا سامنے آئے گا تو ڈر جاؤ گے
یہ گھنی چھاؤں بھی شازش ہے کسی دشمن کی
مجھ کو معلوم تھا تم لوگ ٹھہر جاؤ گے
اس برس قحط ہے اس گاؤں میں شہری بابو
ہاں، مگر تم تو مسافر ہو گزر جاؤ گے
ایک موہوم سی امیدِ سحر کو لے کر
رات کا وقت ہے اے دوست کدھر جاؤ گے
آسمانوں کی طرف دیکھ رہے ہو ایسے
جیسے دریا کی ترائی میں اتر جاؤ گے

۲

جانے یہ کس کی بنائی ہوئی تصویریں ہیں
تاج سر پر ہیں مگر پاؤں میں، زنجیریں ہیں
کیا مری سوچ تھی کیا سامنے آیا میرے
کیا مرے خواب تھے کیا خواب کی تعبیریں ہیں
کتنے سر ہیں کہ جو گردن زدنی ہیں اب بھی
ہم کہ بزدل ہیں مگر ہاتھ میں شمشیریں ہیں
چار جانب ہیں سیہ رات کے سائے لیکن
افقِ دل یہ نئی صبح کی تنویریں ہیں
اُس کی آنکھوں کو خدا یونہی سلامت رکھے
اُس کی آنکھوں میں مرے خواب کی تعبیریں ہیں

۳

ظلمت کے تلاطم سے ابھر کیوں نہیں جاتے
اترا ہوا دریا ہے گزر کیوں نہیں جاتے

بادل ہو تو برسو کبھی بے آب زمیں پر
خوشبو ہو اگر تم تو بکھر کیوں نہیں جاتے

جب ڈوب ہی جانے کا یقیں ہے تو نہ جانے
یہ لوگ سفینوں سے اتر کیوں نہیں جاتے

روکے گی درختوں کی گھنی چھاؤں سرِ راہ
آواز سی آئے گی ٹھہر کیوں نہیں جاتے

اب اپنے ہی سائے کے تعاقب میں نکل جاؤ
جینے کی تمنّا ہے تو مر کیوں نہیں جاتے

تم راہ میں چپ چاپ کھڑے ہو تو گئے ہو
کس کس کو بتاؤ گے کہ گھر کیوں نہیں جاتے

ہر بار ہمیں ہیں ہدفِ سنگِ ملامت
الزام کسی اور کے سر کیوں نہیں جاتے

۴

ٹوٹتے رشتوں کا آئینہ عجب ہو جائے گا
ایک دن انسان بے نام و نسب ہو جائے گا

صبح کے ہاتھوں سے گر جائے گا سورج شام تک
دیکھتے ہی دیکھتے مصلوبِ شب ہو جائے گا

میرے اس کے درمیاں حائل کئی کہسار ہیں
مجھ تک آتے آتے بادل تشنہ لب ہو جائے گا

کوئی اُس جیسا نہیں ہے شہر کی اِس بھیڑ میں
دیکھ لینا وہ بھی اک دن بے ادب ہو جائے گا

اس نے پوچھا تھا کبھی میری اداسی کا سبب
اب کوئی مت پوچھنا ورنہ غضب ہو جائے گا

۵

اب اپنی ہی دہلیز پہ چپ چاپ کھڑا ہوں
صدیوں کا عقیدہ ہوں مگر ٹوٹ چکا ہوں
اک چیخ سنا کرتا ہوں ہر شام کسی کی
ہر صبح یہ لگتا ہے کہ میں قتل ہوا ہوں
نیلا ہے ہر اک رنگ ان آنکھوں میں ابھی تک
میں نے بھی کئی زہر پیے ہیں تو جیا ہوں
اب اپنا کوئی عکس بھی پاؤ گے نہ مجھ میں
اُمید کا سورج ہوں مگر ڈوب چکا ہوں
ہوتا ہے کوئی عزم شکستہ تو کہیں سے
آتی ہے اک آواز کہ ہاں میں ہی خدا ہوں

بانی: منچندا

(۱)

دن کو دفتر میں اکیلا، شب... بھرے گھر میں اکیلا
میں کہ عکسِ منتشر، ایک ایک منظر میں اکیلا

اڑ چلا وہ، اک جدا خاکہ لیے سر میں... اکیلا
صبح کا پہلا پرندہ آسماں بھر میں اکیلا

کون دے آواز، خالی رات کے اندھے کنوئیں میں
کون اُترے.... خواب سے محروم بستر میں.... اکیلا

اس کو تنہا کر گئی کروٹ کوئی پچھلے پہر کی
پھر اُڑا بھاگا وہ سارا دن، نگر بھر میں، اکیلا

ایک مدھم آنچ سی آواز، سرگم سے الگ کچھ
رنگ اک دبتا ہوا سا، پورے منظر میں اکیلا

بولتی تصویر میں اک نقش لیکن کچھ ہٹا سا،
ایک حرفِ معتبر، لفظوں کے لشکر میں اکیلا

جاؤ موجو، میری منزل کا پتا کیا پوچھتی ہو،
اک جزیرہ.... دور افتادہ.... سمندر میں.... اکیلا

جانے کس احساس نے آگے نہیں بڑھنے دیا تھا
اب پڑا ہوں قید، میں رستے کے پتھر میں اکیلا

ہوبہو میری طرح چپ چاپ مجھ کو دیکھتا ہے
اک لرزتا، خوبصورت عکس، ساغر میں اکیلا

(۲)

میں اس کی بات کی تردید کرنے والا تھا
اک اور حادثہ مجھ پر گزرنے والا تھا
کہیں سے آ گیا اِک ابرِ درمیاں، ورنہ
میرے بدن میں یہ سورج اترنے والا تھا
مجھے سنبھال لیا تیری ایک آہٹ نے
سکوتِ شب کی طرح میں بکھرنے والا تھا
عجیب لمحۂ کمزور سے میں گزرا ہوں
تمام سلسلہ پل میں بکھرنے والا تھا
میں لڑکھڑا سا گیا سایۂ شجر میں ضرور
میں راستے میں مگر کب ٹھہرنے والا تھا
اب آسماں بھی بڑا شانت ہے زمیں بھی سُکھی
گزر گیا ہے جو ہم پر گزرنے والا تھا
لگا جو پیٹھ میں آ کر وہ تیر تھا کس کا
میں دشمنوں کی صفوں میں نہ مرنے والا تھا

۳

اک ڈھیر راکھ میں سے شرر چن رہا ہوں میں
خوابوں کے درمیان خبر چن رہا ہوں میں

کیا دل خراش کام ہوا ہے مرے سپرد
اک زرد رُت کے برگ و ثمر چن رہا ہوں میں

اک خواب تھا کہ ٹوٹ گیا خوں کے حبس میں
اب تند دھڑکنوں کے بھنور چن رہا ہوں میں

کیا جانے اس کے خط میں دھواں کیا ہے حرف حرف
مفہوم چن رہا ہوں، اثر چن رہا ہوں میں

اے رمز آشنائے تجسّس، ادھر بھی دیکھ
اندھے سمندروں سے گہر چن رہا ہوں میں

وہ مستقل غبار ہے چاروں طرف کہ اب
گھر کے تمام روزن و در چن رہا ہوں میں

باقی نظر کا زاویہ بدلا ہے اس طرح
اب ہر فضا سے چیزِ دگر چن رہا ہوں میں

(۴)

کچھ نہ کچھ ساتھ اپنے یہ اندھا سفر لے جائے گا
پاؤں میں زنجیر ڈالوں کا تو سر لے جائے گا
اندر اندر ریک بیک اٹھے گا طوفانِ نفی
سب نشاطِ نفع ، سب رنجِ ضرر لے جائے گا
ایک پیلا رنگ باقی رہ گیا ہے آنکھ میں
ڈوبتا منظر اُسے دامن میں بھر لے جائے گا
گھومتا ہے شہر کے سب سے حسیں بازار میں
اک اذیت ناک محرومی وہ گھر لے جائے گا
منتظر اک لمحۂ سادہ اُمیدی کا ہوں میں
جانے کب آئے گا ، سینے کے بھنور لے جائے گا
اب نہ لائے گا کوئی اس کا پتا میرے لیے
اور وہاں کوئی نہ اب میری خبر لے جائے گا
اس قدر خالی ہوا بیٹھا ہوں اپنی ذات میں
کوئی جھونکا آئے گا ! جانے کدھر لے جائے گا

(۵)

ہوائیں زور سے چلتی تھیں ہنگامہ بلا کا تھا
میں سناٹے کا پیکر منتظر تیری صدا کا تھا

وہی اِک موسم سفّاک تھا، اندر بھی، باہر بھی
عجب سازش لہو کی تھی، عجب فتنہ ہوا کا تھا

ہم اپنی چپ کو افسوں خانۂ معنی سمجھتے تھے
کہاں دل کو خبر تھی، امتحاں حرف و صدا کا تھا

ہمارے دوست بننے کی ضرورت حادثے کی تھی
عجب اک مرحلہ سا درمیاں میں ابتدا کا تھا

ہم اپنے ذہن میں کیا کیا تعلق اس سے رکھتے تھے
وہاں سارا کرشمہ ایک بے معنی ادا کا تھا

وہاں ٹھنڈی سی سماعت تھی سمندر کی طرح باقی
یہاں الفاظ پر سایہ کسی بنجر صدا کا تھا

بسمل سعیدی

(۱)

گزر کے عشق کی حد سے بھی کچھ یہ عالم ہے
کہ جیسے عشق ابھی اُن کے حُسن سے کم ہے

عدو کا گھر ہے تری راہ میں تو کیا غم ہے
سُنا ہے خُلد کے رستے میں بھی جہنّم ہے

غلط ہے یہ کہ مزاجِ زمانہ برہم ہے
زمانہ کیا ہے تمہاری نظر کا عالم ہے

یہ وقت کل نہ رہے گا رہیں گے یاد یہ دن
ستم کی عمر زیادہ ہے زندگی کم ہے

وہ اپنے ظلم سے خود بھی نہ رہ سکے محفوظ
جبیں پر آج نہ بل ہے نہ زلف میں خم ہے

خوشا یہ آتشِ عشق، آدمی کا ذکر تو کیا
فرشتے جلتے ہیں جس میں یہ وہ جہنّم ہے

حریمِ ناز تک ان کے ہزار عالم ہیں
حریمِ ناز تو پھر عالموں کا عالم ہے

عبادتوں کے لیے فرصتیں ہیں لوگوں کو
ہمیں گناہ بھی کرنے کو زندگی کم ہے

زہے یہ وقت کہ بسمل بقولِ ناظم کے
اب آفتاب سے اونچا مقامِ شبنم ہے

(۲)

اثرِ اندوزِ دو عالم نہیں ہونے پاتی
تیری محفل کبھی برہم نہیں ہونے پاتی

وسعتیں عشق کی محدود ہوئی جاتی ہیں
آرزو ہے کہ ابھی کم نہیں ہونے پاتی

اپنے احساسِ مسرت کو بھی کھو دیتی ہے
جب محبت سببِ غم نہیں ہونے پاتی

مل گیا رنگ بھی تخلیق میں تیری ورنہ
صرف نکہت تو مجسم نہیں ہونے پاتی

اللہ اللہ رے محبت کا وہ عالم کہ یہ جب
کوئی ٹھہرا ہوا عالم نہیں ہونے پاتی

تم سے آنسو بھی مرے اب نہیں پونچھے جاتے
جذبِ خورشید سے شبنم نہیں ہونے پاتی

ہائے بے ربطیٔ انفاسِ محبت بسمل
آہ کم بخت بھی ہمدم نہیں ہونے پاتی

(۳)

مجھے اب فکرِ دل کی ہے نہ اب اندیشۂ جاں ہے
محبّت، اپنی اس منزل سے خود میری نگہباں ہے
شعاعِ مہر میں رنگینیاں جیسے بہاروں کی
کسی کے حُسن کا عالم ہے یا صبحِ گلستاں ہے
بہی جاتی ہو جیسے روح فرطِ شادمانی سے
الٰہی چشمِ گریاں آج کس کے زیرِ داماں ہے
وہی اِک حُسن ہے حُسنِ شباب اور حُسنِ صورت میں
کہیں سے کچھ نمایاں ہے کہیں سے کچھ فروزاں ہے
بنا کر بھیجتی ہیں جنّتیں پھولوں کے پروانے
یہ کس کے حُسن سے روشن مری شمعِ شبستاں ہے
نسیمِ صبح سے مُنھ پھیر کر یہ مُسکراتے ہیں
گلوں میں کس کا اندازِ تبسّم ہائے پنہاں ہے
قبولِ اعتبارِ حُسن اگر ہو جائے یہ بسمل
محبّت ایک وعدہ ہے تمنّا ایک پیماں ہے

۴

محبت میں کہیں یوں بھی کوئی برباد ہوتا ہے
کہ جو عالم گزر جاتا ہے مجھ کو یاد ہوتا ہے
خرابِ عشق ہونا غایتِ مفہومِ ہستی ہے
وہ دل آباد ہو جاتا ہے جو برباد ہوتا ہے
نہیں ہے شاد کامِ آرزو ہوتا اگر ان سے
تو پھر ان کے تصور سے بھی دل کیوں شاد ہوتا ہے
جہانِ حسن میں دل کی پرستش گاہ کچھ بھی ہو
مگر آنکھوں کا اک کعبہ الگ آباد ہوتا ہے
یہ ان کی بے نیازی ہے کہ وہ سجدوں کو ٹھکرا دیں
کہیں اپنا مذاقِ بندگی برباد ہوتا ہے
جنونِ عشق بسمل ان خیالوں ہی کو کہتے ہیں
کہ جن سے شاد فرقت میں دلِ ناشاد ہوتا ہے

(۵)

میں بھی مشکل سے اٹھا رشک بھی مشکل سے اٹھا
دل وہیں بیٹھ گیا جب تری محفل سے اٹھا

تری محفل کے علاوہ کوئی عالم ہی نہیں
وہ کہیں کا نہ رہا جو تری محفل سے اٹھا

آپ میں آنے کی پھر کوئی جہت ہی نہ رہی
میں تری بزم سے جب تیرے مقابل سے اٹھا

عینِ دریا کا تلاطم تو رہا ساحل تک
ہو گیا قہر وہ طوفان جو ساحل سے اٹھا

ڈگمگاتا تھا اِدھر پائے طلب کا بسمل
شورِ لبیک اُدھر جانبِ منزل سے اٹھا

بیخود دہلوی

۱

رات بھر گردش تھی ان کے پاسبانوں کی طرح
پاؤں میں چکر تھا میرے آسمانوں کی طرح
دل میں ہیں لیکن انھیں دل سے غرض مطلب نہیں
اپنے گھر میں رہتے ہیں وہ میہمانوں کی طرح
دل کے دینے کا کہیں چرچا نہ کرنا دیکھنا
لے کے دل سمجھا رہے ہیں مہربانوں کی طرح
نام پر مرنے کے مرتے ہیں، مگر مرتے نہیں
کون جی سکتا ہے ہم سے سخت جانوں کی طرح
دل جو کچھ کہتا ہے، کرتے ہیں وہی بیخود مگر
سن لیا کرتے ہیں سب کی بے زبانوں کی طرح

(٢)

دل چرا لے گئی دزدیدہ نظر دیکھ لیا
ہم نہ کہتے تھے کہ اس چور نے گھر دیکھ لیا
بندہ پرور غمِ فرقت کا اثر دیکھ لیا
داغِ دل دیکھ لیا داغِ جگر دیکھ لیا
قد بھی کم، عمر بھی کم، مشقِ ستم اور بھی کم
کر چکے قتل مجھے، جایئے گھر، دیکھ لیا
شکوے کے ساتھ لگاوٹ بھی چلی جاتی ہے
جب کیا کچھ تو کنکھیوں سے ادھر دیکھ لیا
داد خواہوں پہ نئی حشر میں آفت آئی
صف کی صف لوٹ گئی اس نے جدھر دیکھ لیا
قتلِ عشاق پہ لو اور اٹھاؤ خنجر
جھک گئی بارِ نزاکت سے کمر دیکھ لیا
نہ چھٹا تم سے یہ مے خانے کا رستہ بیخود
منہ چھپائے ہوئے جاتے ہو کدھر دیکھ لیا

(۳)

جو تماشا نظر آیا، اُسے دیکھا، سمجھا
جب سمجھ آگئی، دنیا کو تماشا سمجھا
اس کی اعجاز نمائی کا تماشائی ہوں
کہیں جگنو بھی جو چمکا ید بیضا سمجھا
میں یہ سمجھا ہوں کہ سمجھے نہ مری بات کو آپ
سر ہلا کر جو کہا آپ نے "اچھا سمجھا"
اثرِ حسن کہوں یا کششِ عشق کہوں
میں تماشائی تھا، وہ مجھ کو تماشا سمجھا
کیا کہوں میرے سمجھنے کو سمجھ ہے درکار
خاک سمجھا جو مجھے خاک کا پتلا سمجھا
ایک وہ ہیں جنھیں دنیا کی بہاریں ہیں نصیب
ایک میں ہوں قفسِ تنگ کو دنیا سمجھا
میرا ہر شعر ہے اِک رازِ حقیقت بیخود
میں ہوں اردو کا نظیری مجھے تو کیا سمجھا

۴

قیامت ہے جو ایسے پر دلِ امیدوار آئے
جسے وعدے سے نفرت ہو جسے ملنے سے عار آئے

ہمارا فرض تھا سر کو تہِ شمشیر رکھ دینا
قضا کو کیا کریں ہم بوجھ گردن کا اتار آئے

مرا دل مجھ کو واپس دیجیے سب کچھ میں بھر پایا
قسم لے لیجے مجھ سے پھر اگر یہ جانثار آئے

نگاہِ ناز خنجر تھی، چھری تھی، تیر تھی، کیا تھی
نکل کر جو تری محفل سے آئے دلفگار آئے

اجازت مانگتی ہے دخترِ رز محفل میں آنے کی
مزا ہو شیخ صاحب کہہ اٹھیں "بے اختیار آئے"

نہ مندر میں نشاں اس کا نہ مسجد میں پتا اس کا
یہاں بھی ڈھونڈ آئے ہم، وہاں بھی ہم پکار آئے

خدا جانے کہ وہ بیخود سے اتنے بدگماں کیوں ہیں
کہ ہر جلسے میں فرماتے ہیں دیکھو ہوشیار آئے

(۵)

ایسا بنا دیا تجھے، قدرت خدا کی ہے
کس حُسن کا ہے حُسن، ادا کس ادا کی ہے
چشمِ سیاہِ یار سے سازش حیا کی ہے
لیلیٰ کے ساتھ میں یہ سہیلی بلا کی ہے
تصویر کیوں دکھائیں تمھیں نام کیوں بتائیں
لائے ہیں ہم کہیں سے کسی بے وفا کی ہے
مغرور کیوں ہیں آپ جوانی پر اس قدر
یہ میرے نام کی ہے یہ میری دعا کی ہے
کہہ دو کہ بے وضو نہ چھوئے اس کو محتسب
بوتل میں بند روح کسی پارسا کی ہے
میں امتحان دے کے انھیں کیوں نہ مر گیا
اب غیر سے بھی ان کو تمنّا وفا کی ہے
دیکھو تو جا کے حضرتِ بیخود نہ ہوں کہیں
دعوت شراب خانے میں اک پارسا کی ہے

پاشی : کمار پاشی

(۱)

خوش ہوا اے دنیا کہ اک اچھی خبر لے آئے ہیں
سب غموں کو ہم منا کر اپنے گھر لے آئے ہیں
اس قدر محفوظ گوشہ اس زمیں پر اب کہاں
ہم اٹھا کر دشت میں دیوار و در لے آئے ہیں
سنسناتے آسماں میں ان پہ کیا گزری نہ پوچھ
آنے والے خون میں تر بال و پر لے آئے ہیں
دیکھتا ہوں دشمنوں کا ایک لشکر ہر طرف
کس جگہ مجھ کو یہ میرے ہم سفر لے آئے ہیں
میں کہ تاریکی کا دشمن میں اندھیروں کا حریف
اس لیے مجھ کو ادھر اہلِ نظر لے آئے ہیں

(۲)

غفلت زدوں کے شہر میں ہشیار کون ہے
جب میں ہی سو رہا ہوں تو بیدار کون ہے

خود بڑھ کے روک دیتا ہے وہ راستہ مرا
پھر پوچھتا ہے راہ کی دیوار کون ہے

تجھ سا یہ ہو بہو مرے اندر چھپا ہوا
ناراض سب سے خود سے یہ بیزار کون ہے

نیکی کرو کنویں میں گرا دو خلوص کو
اس جنسِ رائیگاں کا خریدار کون ہے

کس نے دیے جلائے ہیں پاشی مرے لیے
مجھ کو بلا رہا ہے جو اُس پار کون ہے

(۳)

دیکھ لے تو بھی ذرا آ کر تماشا دھوپ کا
راستے میں دُور تک پھیلا ہے سایا دھوپ کا

وحشتِ بے آغاز و بے انجام ہے چاروں طرف
جانے اب کس اور جائے گا پرندا دھوپ کا

دن کے ڈھلنے کی خبر کس کو سنائے گا کوئی
لوگ اندھے ہو گئے پڑھ کر تراشا دھوپ کا

آسمانوں سے نہ اترے گا کوئی سایہ کبھی
سو رہو اب اوڑھ کر یارو لبادا دھوپ کا

کھو گیا آکاش کے سایوں میں چڑیوں کا ہجوم
بہہ گیا شب کے سمندر میں جزیرا دھوپ کا

میز پر یہ پتیاں پھولوں کی ہیں یا اس کے لب
فرش پر یہ اس کا چہرا ہے کہ ٹکڑا دھوپ کا

رات کی تاریکیوں کا خوف اب پا شی نہیں
چل دیے ہیں گھر سے ہم لے کر اجالا دھوپ کا

(۴)

بھولے بسرے ہوئے غم یاد دلاتی ہے ہوا
جانے کن دور کی گلیوں سے بلاتی ہے ہوا

اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ مجھے شام ڈھلے
اجنبی شہر کا اک خواب دکھاتی ہے ہوا

اٹھ گیا کون بھرے گھر کا اجالا لے کر
سسکتی ہے بہت شور مچاتی ہے ہوا

کیوں ہوئی ہے یہ مری جان کی پیاسی آخر
کیوں مرے گھر کے چراغوں کو بجھاتی ہے ہوا

چھوڑ آتی ہے مجھے دور بیابانوں میں
جب بھٹک جاؤں تو پھر راہ دکھاتی ہے ہوا

شام ہوتے ہی وہ سو جاتے ہیں چھت پر جا کر
اور پھر رات گئے ان کو جگاتی ہے ہوا

آج پھر گزریں گے وہ جیسے ادھر سے پاشی
یوں مرے گھر کے در و بام سجاتی ہے ہوا

(۵)

بے منظری کا زہر جو آنکھوں میں بھر گیا
میرے سفر کو اور بھی دشوار کر گیا
جنگل میں آرزو کے گھنی رات چھا گئی
تنہائیوں کا درد فضا میں بکھر گیا
سب کچھ لٹا کے بیٹھے ہیں رستے میں بے سبب
اس شوخ کا خیال بھی دل سے اتر گیا
اپنے سوا تھا کون! میں دیتا جسے شراپ
اپنے ہی سر پہ ہاتھ رکھا اور مر گیا
اک نقش بے صدا کی ہے اب جستجو ہمیں
ہاشمی نظر سے ہر گلِ منظر گزر گیا

تاباں : غلام ربانی تاباں

(۱)

ہزار قطرہ سہی بحرِ بیکراں سا لگے
وہ ایک درد کا لمحہ کہ جاوداں سا لگے

دلوں پہ پڑنے لگے مصلحت کے سائے سے
خلوصِ شوق بھی اب جنسِ رائیگاں سا لگے

شکستِ خواب کوئی طرفہ حادثہ بھی نہیں
کسی پہ گزرے تو کم بخت رائیگاں سا لگے

نجانے گردِ سفر ہے کہ آندھیوں کا غبار
جدھر نگاہ اٹھاؤں دھواں دھواں سا لگے

بسی ہوئی ہیں ہوائیں جنوں کی خوشبو میں
پھر آج دامنِ تمکیں کا امتحاں سا لگے

یہ اور بات ہے یاروں نے کم سخن جانا
مرا یہ حال کہ ہر لفظ داستاں سا لگے

جراحتوں کے چمن جیسے کھل اٹھے تاباں
زمانہ اہلِ محبت پہ مہرباں سا لگے

(۲)

کھلیں کھلیں نہ کھلیں پھول دل کے صحرا میں
بڑی کشش ہے مگر انتظارِ فردا میں
مرا وجود بھی جیسے بچھڑ گیا مجھ سے
عجیب حادثہ گزرا رہِ تمنّا میں
حیات صرف حقیقت نہ صرف افسانہ
کئی سراب بھی حل ہو گئے ہیں دریا میں
یہ اور بات ہے ٹوٹے نہ بے حسی کا طلسم
صدا لگاتے رہو پتھروں کے صحرا میں
خرد کے دور میں دیوانگی غنیمت ہے
بڑا سکون ملا شورشوں کی دنیا میں
کبھی یقیں ہی یقیں ہے کبھی گماں ہی گماں
کسی کی پیاس نے افسوں بھرے ہیں صہبا میں
نشاط و غم کے تصوّر بدل گئے تاباںؔ
عجیب لطف تھا آزردگئ بیجا میں

(۳)

رہ گزر ہو یا مسافر نیند جس کو آئے ہے
گرد کی میلی سی چادر اوڑھ کے سو جائے ہے

قربتیں ہی قربتیں ہیں دوریاں ہی دوریاں
آرزو جادو کے صحرا میں مجھے دوڑائے ہے

وقت کے ہاتھوں ضمیرِ شہر بھی مارا گیا
رفتہ رفتہ موجِ خوں سر سے گزرتی جائے ہے

میری آشفتہ سری وجہِ شناسائی ہوئی
مجھ سے ملنے روز کوئی حادثہ آجائے ہے

یوں تو اک حرفِ تسلی بھی بڑی شے ہے مگر
ایسا لگتا ہے وفا بے آبرو ہو جائے ہے

تشنگی کی تلخیاں دیتی ہیں خوابوں کو جنم
تشنگی صحرا میں دریا کا سماں دکھلائے ہے

کس طرح دستِ ہنر میں بولنے لگتے ہیں رنگ
مدرسے والوں کو تاباں کون سمجھا پائے ہے

۴

بے رخی بے اعتنائی کا گلا لے جائے گی
بزم گل سے اور کیا باد صبا لے جائے گی

دوست بن کر دل میں تو آئی تھی سکوں کی آرزو
کس نے سوچا تھا کہ سب رونق چرا لے جائے گی

شاخ سے ٹوٹے ہوئے پتوں کی آخر کیا بساط
جس طرف چاہے گی جنگل کی ہوا لے جائے گی

راہرو کا ساتھ تو کیا دے گی دن کی روشنی
جاتے جاتے سارے منظر بھی اٹھا لے جائے گی

ایسا لگتا ہے کہ دریا کی کوئی بے تاب موج
ساتھ اپنے کچھ سفینے بھی بہا لے جائے گی

یوں بھی ہوگا بے گناہوں کے لہو کی بوند بوند
دست قاتل کے لیے رنگِ حنا لے جائے گی

ذوق کے مصرعے سے تاباں استفادہ کیجیے
زندگی لائی تھی اک دن اور قضا لے جائے گی

۵

سحر کے بعد بھی اکثر سحر نہیں ہوتی
ہوائے دہر بہت معتبر نہیں ہوتی

یہ افتخار بھی کیا کم ہے زندگی کے لیے
وہ بے ثبات سہی بے ہنر نہیں ہوتی

یہ اور بات ہے پھر کوئی حادثہ ہو جائے
مسافروں سے خفا رہ گزر نہیں ہوتی

عجیب بات ہے کس کو یقین آئے گا
اُدھر بھی ہوتی ہے منزل جدھر نہیں ہوتی

چمن میں چشم و چراغِ چمن کسے کہتے
اگر سیاستِ برق و شرر نہیں ہوتی

سزا تو یہ ہے کہ بستی میں بے نواؤں کی
گھروں کو حاجتِ دیوار و در نہیں ہوتی

جہاں کے غم کی روایت کا کیا گلا تاباںؔ
طلب کی رات رہینِ سحر نہیں ہوتی

تلخ ؔبمن موہن تلخؔ

(۱)

کیا مرحلہ سماعتِ صبر آزما کا ہے
اک بوجھ ہر زبان پہ اپنی صدا کا ہے
کوئی بھی اپنی بات میں موجود تک نہیں
یہ ربط منتظر ابھی تک ابتدا کا ہے
کوئی بھی ایک دوسرے سے بولتا نہیں
چاروں طرف یہ شور مگر کس بلا کا ہے
اک لاپتہ سے شہر کا جیسے ہوں درد ہم
کچھ رنگ ہی عجیب ہماری صدا کا ہے
امکان کا جو درد ہوا جا رہا ہوں میں
شاید کہ آج سامنا پھر ماورا کا ہے
اب آہٹوں پہ چونکنا ٹھہری ہے رسم ورا ہ
اک سلسلہ سا دوری آواز پا کا ہے
کچھ گونجتا سا ہے مرے اندر کوئی کھنڈر
پڑتا ہوا سا پانو کسی آشنا کا ہے

(۲)

تیرے چپ چاپ گزرنے پہ صدا سی آئے
سامنے آتے ہوئے ہونٹ بھی کپکپا سی آئے
جس سے آوازیں لو دیتی ادا سی آئے
آنچ اس فکر کی مجھ تک بھی ذرا سی آئے
بند کمروں میں کھلی چھت سے تعلق کی رمق
جس طرح بند ہوا میں بھی ہوا سی آئے
کس سے طے ہو نہیں پاتا مرے گھر کا زینہ
کس کے آنے کی یہ ہر لحظہ صدا سی آئے
ہم وہ ہنستا ہوا باہر ہیں کہ گھر تک جس کی
کبھی آواز بھی آئے تو ذرا سی آئے
کوئی سیلاب کہ مجھ اندھے کنویں سے اکثر
جو صدا آئے کسی عکس کی پیاسی آئے
کون یہ میری طرف مجھ کو لیے جاتا ہے
کیا یہ ہر لمحہ چٹخنے کی صدا سی آئے
یاد آ جائے کہ لہجوں کے وہ رشتے کیا تھے
وہی پہلی سی جو لہجے میں ادا سی آئے
جانے گھر لوٹتے میں راستے کیوں پوچھتے ہیں
تلخ کیا بھولنے میں عمر گنوا سی آئے

(۳)

اندھے پانی سے بھی نیچے کا بسیرا ہوں میں
تجھ سمندر کا گھٹا ٹوپ اندھیرا ہوں میں

لوگ سنتے ہیں مری بات چلے جاتے ہیں
کن صداؤں کا اجڑتا ہوا ڈیرا ہوں میں

کون ہے جو نہ اکیلا بھی مجھے ہونے دے
کیسی آواز یہ آئی ہے کہ تیرا ہوں میں

ہاتھ کے ہاتھ بڑھاتے چلے جاؤ مجھ کو
دھوپ چڑھنے کو ہے پل بھر کا سویرا ہوں میں

بس کہ پہچان کی تردید ہوا جاتا ہوں
دم بدم چہروں کا چھٹتا ہوا گھیرا ہوں میں

یوں بھرے گھر کی صدا روز جگاتی ہے مجھے
جیسے اک سونی کھلی چھت کا سویرا ہوں میں

تلخ آواز کے رشتے نہ یہاں قائم کر
اس بھرے شہر میں جوگی کا سا پھیرا ہوں میں

۴

ان گنت گم شدہ عرصوں کی کسک ہے مجھ میں
مت صدا دو کہ قیامت کی لپک ہے مجھ میں
جان پڑتا ہے کہ ہر شخص مجھے جانتا ہے
کیا کہوں خود کہ یہی ایک جھجک ہے مجھ میں
کب کا میں ڈوب چکا اپنا ہی سورج بن کر
اب یہ کیوں گھور اندھیروں کی چمک ہے مجھ میں
بولتا رہتا ہے مجھ سے یہ تعلق تیرا
ان کہی سی تری باتوں کی کسک ہے مجھ میں
چھو کے دیکھو مجھے کس شخص پہ کیا بیت گئی
سینکڑوں بھاگتے لمحوں کی دھمک ہے مجھ میں
کوئی دونوں کا عجب درد سہے جاتا ہے
کچھ عجب سی ترے اندر کی جھلک ہے مجھ میں
تیری آواز سے ہوں سوچتی چپ کا صدمہ
ورنہ پاگل کی صدا کی سی ہمک ہے مجھ میں
میری چپ سے بھی صداؤں کی شعاعیں نکلیں
ایسے لہجے کی تپسیا کی دمک ہے مجھ میں
تلخ مت دے کسی آواز کا اس لمحے جواب
اک عجب ٹوٹتا بنتا ہوا اشک ہے مجھ میں

(۵)

حرف و صدا کے ساتھ مکمل ہوا ہوں میں
اب چپ کی ضد کہو مجھے، پاگل ہوا ہوں میں
تجھ کو بلا بلا کے تجھے ڈھونڈتے ہوئے
خود اپنی ہی صداؤں کا جنگل ہوا ہوں میں
اُترا اتھا لامکاں سے کہیں دھوپ کی طرح
لمسِ زمیں سے مثلِ زمیں شل ہوا ہوں میں
جب تک دکھائی دوں تو ادھورا کہو مجھے
گم ہوں تو جان لو کہ مکمل ہوا ہوں میں
یا گردِ گفتگو کا کفن مجھ پر پڑ گیا
یا خود ہی اپنی آنکھ سے اوجھل ہوا ہوں میں
یہ میری ذات ہے کہ کوئی گونجتا کھنڈر
اپنی صدا پہ آپ ہی پاگل ہوا ہوں میں
جو لوگ تلخ مجھ سے ملے خود اُلجھ گئے
اک مسئلہ ہوں اب بھی کہاں حل ہوا ہوں میں

ثروت : نورجہاں ثروت

۱

پھر کوئی اپنی وفا کا واسطہ دینے لگا
دور سے آواز مجھ کو حادثہ دینے لگا
طے کرو اپنا سفر تنہائیوں کی چھاؤں میں
بھیڑ میں کوئی تمھیں کیوں راستہ دینے لگا
راہزن ہی راہ کے پتھر اٹھا کر لے گئے
اب تو منزل کا پتا خود قافلہ دینے لگا
قربتوں کی آنچ میں جلنے سے کچھ حاصل نہ تھا
کیسے کیسے لطف دیکھو فاصلہ دینے لگا
شہر ناپرساں میں اے ثروت سبھی قاضی بنے
یعنی ہر نافہم اپنا فیصلہ دینے لگا

(۲)

خوشی بادلوں، بادبانوں میں ہے
تخیل کی اونچی اڑانوں میں ہے
حویلی تھی اجداد کی جس کے نام
وہی شخص تو سرد خانوں میں ہے
وہ خوشبو تھا، جھونکا ہواؤں کا تھا
وہ جو کچھ بھی تھا اب بیانوں میں ہے
وفا نام جس کا محبّت بھی تھا
ہے انمول پھر بھی دکانوں میں ہے
دیئے زندگی کے بجھے اس طرح
دھواں ہی دھواں اب مکانوں میں ہے
جو بیٹھے رہے عمر بھر لب سیے
اب اُن کی صدا آسمانوں میں ہے
ہے نظروں سے اوجھل جو ثروت ابھی
یقیناً کہیں وہ اڑانوں میں ہے

۳

تمام عمر کا قصّہ لکھوں، ارادہ تھا
لکھا تو دل کا ورق اپنا پھر بھی سادہ تھا
گماں یقیں کی حد تک کبھی نہیں آیا
ہماری فہم کا دامن ہی کچھ زیادہ تھا
مجھی پہ ختم ہوئیں دوست داریاں ساری
کہ میرے درد کا دریا بہت کشادہ تھا
نجانے کیسے ہوئی مات بادشاہ کو بھی
ہمارے پاس تو لے دے کے اک پیادہ تھا
تمھارے دور سے ثروت، نباہ کر نہ سکی
کہ اس کے پاس روایات کا لبادہ تھا

۴

ہے مناسب بچ نکلنا خودغرض فنکار سے
ناپتا ہو قد جو اپنا شہر کی مینار سے
عمر بھر دیکھا ہوا وہ آرزو کا خواب تھا
کتنی آسودہ ہوئی ہوں اپنے ہی انکار سے
دست و بازو کی بھی قوت آزما لی جائے گی
زنگ تو پہلے چھڑانے دیجیے تلوار سے
یوں روایت سے بغاوت بے سبب اچھی نہیں
بت پرانے توڑیے ثروت نئے افکار سے

۵

رفاقتوں نے دیے ہیں مجھ کو، یہ رنجشوں کے عذاب سارے
مرے ہی دل پر ہوئے ہیں نازل محبتوں کے عتاب سارے

خوشی کی محفل نہ راس آئی، ہزار چاہا کہ مسکرائیں
تپش سے غم کی، جھلس گئے ہیں شگفتگی کے گلاب سارے

غرور سے سطحِ آب دریا پہ جشنِ ہستی منا رہے تھے
ہوا نے کھینچا جب اپنا دامن، ہوا ہوئے پھر حباب سارے

وہ خوشبوؤں کا لباس پہنے، ملا کچھ ایسے کہ ایک پل میں
پڑے ہوئے تھے جو جسم و جاں پر اتر گئے وہ نقاب سارے

سوال سادہ سا زندگی سے کیا تھا ہم نے بھی ایک ثروتؔ
وہ پتھروں کی ہوئی ہے بارش کہ مل گئے ہیں جواب سارے

جاوید وششٹ

۱

تم جو حُسن کی بات کرو ہو، وہ بھی اک پردا ہے میاں
زلف و لب و رخسار سے آگے، اور بھی اک دنیا ہے میاں
کعبے میں کیا ڈھونڈ رہے ہو؟ کاشی میں کیا کھوجو ہو
سب کچھ اپنے ہی اندر ہے، باہر کیا رکھّا ہے میاں
کون ہو تم، یہ تو پہچانو! سمجھو کچھ، میری مانو
اپنی انا کا راز بھی جانو! آگے نام خدا ہے میاں
یہ میرا، یہ تیرا کیسا؟ کیسی تُو تُو میں میں ہے
ریت سے کس کی پیاس بجھی ہے، دریا تک پیاسا ہے میاں
یہ دنیا سپنے کی مایا، آنکھ کھلے تو کچھ بھی نہیں
سائے کے پیچھے مت بھاگو! سایہ پھر سایا ہے میاں
رمتا جوگی، بہتا پانی، آج یہاں کل جانے کہاں
نگری نگری، بستی بستی، جوگی کا پھیرا ہے میاں

۲

آئینہ گرتے ہی ٹوٹا، عکس بھی پارہ پارہ ہوا
ہوں جیسے کشکولِ نظر میں، حسنِ نظر کی خیراتیں
جلتی آنکھ، سُلگتے آنسو، ہجر کے دہکے انگارے،
پُروائی لے کر آتی ہے، موسم کی یہ سوغاتیں
پھول ہنسے، کلیاں مسکائیں، بھونرے کی نادانی پر
رس کا لوبھی ہے، کیا جانے حسن کی یہ دلکش گھاتیں
تم کیا جانو میری بپتا، تم کیا سمجھو میرا درد،
تم سوچو ہو، خوش منظر ہیں، آنسو آنسو برساتیں
وقت کی رَو میں کب کھو جائے، یہ لمحہ مانندِ موج
جاؔوید اس سے پہلے کر لیں، ان سے کچھ دل کی باتیں

(۳)

(نذرِ سراج اورنگ آبادی)

بھڑکے ہے برہ اگن، جانِ حزیں میں ، تن میں
پھول ٹیسو کے نہیں، آگ لگی ہے بن میں
نیر انکھیاں سیں بہت برسا ، بھرے ساون میں
تیرے درسن کی تمنا ہے، نین کے من میں
عشق کرتا ہے فراموش کہیں دل کی لگی،
تو ہی تو ہے مرے انفاس کی جپ سمرن میں
عشق میں ہو کے فنا، جلوۂ جاناں دیکھا،
اور وہی روپ نظر آیا ہمیں ساجن میں
بخت سوتا ہی رہا ، لاکھ جگایا ہم نے
دل جو بیدار رہا، رات کٹی جاگن میں
ہم نے بیراگ لیا ، راگ تجا، جگ چھوڑا،
خود فراموش ہوئے، دیکھ کے دل درپن میں
داغِ دل عشق اگن سے ہے فروزاں جاوید
ہے وہی نورِ سراج! آپ کے فکر و فن میں

۴

(نذرِ سراج اورنگ آبادی)

وہ جو تیز آگ تھی عشق کی، دلِ عاشقاں میں بھری رہی
تری کائناتِ جمال ہی، میری شعلگی سے بری رہی
ترا ذکر ہے ترے دیس میں، ترا نام ہے لبِ وقت پر
تُو سراجِ بزم ہے آج بھی، ترے فن کی جلوہ گری رہی
وہی کھوئی کھوئی سی زندگی، وہی آئینہ، وہی چہرگی،
جو بھرا تھا دل سو بھرا رہا، جو بھری تھی آنکھ بھری رہی
کوئی بیخودی سی تھی بیخودی، کوئی محویت سی تھی محویت،
ترا نام جس پہ نہ لکھ سکے، وہ بیاض کوری دھری رہی
نہ زمانہ بدلا، نہ بدلے ہم، ہمیں وضع داری کا پاس تھا،
جہاں صرف بارشِ سنگ تھی، وہیں فن کی شیشہ گری رہی
ترے جذب و کیف کی بیخودی، تری عاشقی، تری بندگی،
رہِ عشقِ روح گداز میں، تری کس سے ہم سفری رہی؟
یہ غزل سجا کے وششٹ جی! کرو نذر شاہ سراج کو
بجا اک غزل ہی کا پیرہن، وہ جنوں کی جامہ دری رہی

(۵)

(نذرِ محمد قلی قطب شاہ معانی)

سریجن[1] تھے[2] اے دل کھیا[3] جائے نا
کہ تجھ باج[4] ہم سوں جیا جائے نا
سجن نین کاگد[5] پہ کیسے لکھوں؟
ترا ناؤں[6] جل پر لکھا جائے نا
توں اپنی بہاراں کوں گُل ریز رکھ!
یو داماں جنوں کا سیا جائے تا

ق

وو[7] جانتے ہے ہم قطب کے یار ہیں
ہمیں دیکھ من میں لجا جائے نا
معانی کی پیاری "چھبیلی"[8] سکی[9]
ہمن[10] سوں کہیں دل لگا جائے تا
توں آئے تو، یو[11] آگ گلزار ہو
یو برہا[12] اگن تن جلا جائے نا
ہے جاوید عاشق دکن کا سدا
یو سندیس لے کر صبا! جائے نا

---

[1] محبوب [2] سے [3] کہا [4] بغیر [5] کاغذ [6] نام [7] وہ [8] محمد قلی کی بارہ پیاریوں میں سے ایک پیاری کا نام [9] سکھی، پیاری [10] ہم سے [11] یہ [12] آتش ہجر

حسن نعیم

۱

ملا نہ کام کوئی عمر بھر جنوں کے سوا
تمام عیش میسر رہے سکوں کے سوا

لگی وہ آگ کہ دیوار و در بھی جل نکلے
کوئی مقیم نہیں گھر میں اب ستوں کے سوا

میں اُس کے جسم کی ناگن پکار سُن بھی چکا
اب اس کی آنکھ میں رکھا ہے کیا فسوں کے سوا

پڑی وہ دھوپ کہ سب رنگ پڑ گئے پیلے
بچا نہیں ہے کوئی سُرخ، میرے خُوں کے سوا

ہر ایک فن کی بنا مدّ و جزرِ دل ہے نعیمؔ
کہ شعر و نغمہ ہیں کیا؟ موجِ اندروں کے سوا

۲

وہ لوٹ آئے تو اس کی بھی کچھ انا رکھیو
فصیلِ قلب کا دروازہ تم کھلا رکھیو

نظر کی آنچ سے کھلتے ہیں پھول وحشت کے
کھلیں یہ پھول تو دامن کو مت بچا رکھیو

دیارِ فن میں جہاں منزلیں بھی فرضی ہیں
تمام عمر بھٹکنے کا حوصلا رکھیو

وہ اک غزال ہے کب تک پہاڑ چھانے گا
کنارِ آبِ حسن خیمۂ وفا رکھیو

(۴)

مٹ گئے سب داغ، داغِ عشق تنہا رہ گیا
گر گئی دیوار لیکن اس کا سایہ رہ گیا
کون مجھ سے پوچھتا ہے روز اتنے پیار سے
کام کتنا ہو چکا ہے، وقت کتنا رہ گیا
اک سمندر رو چکا ہوں، ایک صحرا جل چکا
پھر بھی آنکھوں میں کہاں سے ایک دریا رہ گیا
یوں جیا میں آنکھ بھر کے اس طرف دیکھا نہیں
آسماں میری طرف اک عمر تکتا رہ گیا
مر گیا ہوتا بھروسہ کر کے خوشیوں پر نعیمؔ
غم کی طاقت تھی کہ جس کے بل پہ زندہ رہ گیا

(۴)

مال و متاعِ دشت سرابوں کو دے دیا
جو کچھ زرِ خیال تھا، خوابوں کو دے دیا
رکھنے کا جو گہر تھا اسے دل میں رکھ لیا
بکنے کا تھا جو مال، کتابوں کو دے دیا
سبزوں کو خوش لباس بنا کر زمین نے
کچھ رشک کا جواز گلابوں کو دے دیا
اپنے لہو کی بوند بنا کر دمِ نشاط
اک سوزِ لازوال شرابوں کو دے دیا
آئے نہ جب گرفت میں سیف و قلم نعیم
اپنا تمام کرب ربابوں کو دے دیا

(۵)

قصیدہ تجھ سے، غزل تجھ سے، مرثیا تجھ سے
ہر ایک حرف ہوا صاحبِ نوا تجھ سے
زباں کشائیٔ غم سے کھلی کتابِ خیال
ورق ورق پہ کھلا برگِ مدعا تجھ سے
زمیں سے پھوٹ پڑا چشمۂ جنوں سا ماں
گلوں میں سرد پڑی آتشِ قبا تجھ سے
کہاں سے زود فراموشیوں کی خو سیکھی
جو دیکھیے تو نہ تھی برق آشنا تجھ سے
پہنچ تو جاتا سرِ خیمۂ وفا آباد
مگر ہے سست قدم عمرِ تیز پا تجھ سے
کیے تھے کام جو دل کے سپرد اُن کو بھی
دماغِ دہر سے بڑھ کر ہے اب گلا تجھ سے
ہوا جو کوچۂ تنقید میں حسن رسوا
ملا یا غیب نے غالب کا سلسلا تجھ سے

حیات لکھنوی

۱

سلسلہ خوابوں کا سب یونہی دھرا رہ جائے گا
ایک دن بستر پہ کوئی جاگتا رہ جائے گا
ایک خواہش دل کو غیر آباد کرتی جائے گی
اک پرندہ دور تک اڑتا ہوا رہ جائے گا

چارسو پھیلی ہوئی بے چہرگی کی دھند میں
ایک دن بے عکس ہو کر آئنا رہ جائے گا
ہر صدا اسے بچ کے وہ احساسِ تنہائی میں ہے
اپنے ہی دیوار و در میں گونجتا رہ جائے گا
مدعا ہم اپنا کاغذ پر رقم کر جائیں گے
وقت کے ہاتھوں میں اپنا فیصلا رہ جائے گا
دو گھڑی کے واسطے آکر چلے جاؤ گے تم
پھر مری تنہائیوں کا سلسلا رہ جائے گا
اب دلوں میں کوئی گنجائش نہیں ملتی حیات
بس کتابوں میں لکھا حرفِ وفا رہ جائے گا

(۲)

کئی ستارے یہاں ٹوٹتے بکھرتے ہیں
سب اپنی سطح سے آخر کہاں ابھرتے ہیں
نہ جانے کتنے عذابوں میں مبتلا ہم ہیں
اسی لیے تو نئی آرزو سے ڈرتے ہیں
ہم ایک بار مہیّا نہ کر سکے تجھ کو
ہزار رنگ تری جستجو میں بھرتے ہیں
یہ جگنوؤں کی چمک روشنی نظر بھر کی
ہوا میں اڑتے مسافر کہاں ٹھہرتے ہیں
نفس نفس کے لیے سلسلے تلاش کرو
ہمیشہ لوگ یہاں قربتوں پہ مرتے ہیں
میں کوئی بہتا ہوا بیکراں سمندر ہوں
اک آئینے میں ہزار آئینے ابھرتے ہیں
وہ پستیاں اسی انسان کا مقدّر ہیں
بلندیوں سے فرشتے جہاں اترتے ہیں
ہوا اپنا قرب میسّر تو کچھ بتائیں بھی
کہاں کہاں سے ترے ساتھ ہم گزرتے ہیں
جیاؔت کچھ تو کہو دوستوں کی محفل میں
غموں کی بھیڑ میں اپنے بھی غم نکھرتے ہیں

(۳)

یہ جذبۂ طلب تو مرا مر نہ جائے گا
تم بھی اگر ملو گے تو جی بھر نہ جائے گا
یہ التجا دعا یہ تمنّا فضول ہے
سوکھی ندی کے پاس سمندر نہ جائے گا
جس زاویے سے چاہو مری سمت پھینک دو
مجھ سے ملے بغیر یہ پتھّر نہ جائے گا
دم بھر کے واسطے ہیں بہاریں سمیٹ لو
ویرانیوں کو چھوڑ کے منظر نہ جائے گا
یوں خوش ہے اپنے گھر کی فضاؤں کو چھوڑ کر
جیسے وہ زندگی میں کبھی گھر نہ جائے گا
اس کو بلندیوں میں مسلسل اُچھالیے
لیکن وہ اپنی سطح سے اوپر نہ جائے گا
شہرِ مراد مل بھی گیا اب تو کیا حیاتؔ
مایوسیوں کا دل سے کبھی ڈر نہ جائے گا

(۴)

سونے سونے اجڑے اجڑے سے گھروں میں لے چلو
مجھ کو میرے روز و شب کے منظروں میں لے چلو
کچھ تو اپنے پاس بھی ہو زندگی کے واسطے
کوئی تو سودائے خام اپنے سروں میں لے چلو
نارسائی کا تصور کیوں اڑانوں میں رہے
منزلوں کی دوریاں اپنے پروں میں لے چلو
شہر کی رنگینیوں میں ہیں کہاں گنجائشیں
ذات کی ویرانیاں سب مقبروں میں لے چلو
پھر تمھارے معبدوں کو مل گئے معبود کچھ
پھر ہمارے جسم، مردہ پتھروں میں لے چلو
کچھ نہ کچھ بن جائے گا نقد و نظر کے بعد وہ
مسئلہ کچھ بھی نہ ہو دانشوروں میں لے چلو
آج پہلی بار مجھ سے کوئی ہارا ہے حیات
آج مجھ کو شہر کے بازی گروں میں لے چلو

۵

میں خال وخد کا سراپا تصوّرات میں تھا
دمکتی ذات کا سورج اندھیری رات میں تھا
وہ وقت اب بھی نگاہوں میں جگمگاتا ہے
یہ کائنات تھی مجھ میں، میں کائنات میں تھا
میں شہر شہر کی حیرانیوں سے گزرا ہوں
مرا وجود کبھی شاید عجائبات میں تھا
انا کے دشت میں صدیوں کی دھول اوڑھے ہوئے
نہ جانے کب سے وہ اُلجھا تعصّبات میں تھا
تمام شورِ شرابہ نفس نفس میں لیے
وہ ڈوبتا ہوا احساسِ شبِ برات میں تھا
یہ صبح و شام مُلاقات ہے اجیرن سی
کبھی کبھار کا ملنا تبرّکات میں تھا
حیات ڈھونڈ رہا ہوں وہ لکھنؤ کہ جہاں
شرافتوں کا اثاثہ تکلّفات میں تھا

حیاتؔ : مسودہ حیات

۱

ترے بِن زندگی کا مدّعا نئیں
کہ جیسے میرا اب کوئی خدا نئیں

ترے جانے پہ ہم کو لگ گئی چپ
بہت چاہا مگر پھر لب کھلا نئیں

بہت آئے دلوں کی نذر لے کر
مگر تیرا سا دل ہم کو ملا نئیں

ہزاروں خط لکھے ہیں ہم نے تجھ کو
مگر اک حرف بھی جیسے لکھا نئیں

ترے دم سے مہکتا تھا گلستاں
ترے بِن غنچۂ معنی کھلا نئیں

بہت روکے ترے جانے پہ آنسو
مگر یہ ضبط پھر ہم سے ہوا نئیں

لگا جو داغ دل پر روزِ اوّل
مٹاتا تو بہت چاہا مٹا نئیں

تو جانِ آرزو ہے جانِ جاناں
ترے آگے مگر ہم نے کہا نئیں

حیاتؔ اب زندگی کی ہے وہ منزل
کہ اپنا آسرا بھی آسرا نئیں

(۲)

دل لے گیا نہ لغزشِ پا لے گئی مجھے
مقتل میں صرف میری ادا لے گئی مجھے

آتے نہیں نظر مجھے اپنے وہ لالہ زار
یہ کون سے نگر میں ہوا لے گئی مجھے

وہ تو جفا کی راہ میں حد سے گزر گیا
اس کی گلی میں پھر بھی وفا لے گئی مجھے

پایاب تھا مرے لیے ہر بحرِ بیکراں
لیکن بس ایک موج بہا لے گئی مجھے

میں تو چلی تھی آج تیرے شہر کی طرف
صحرا میں پھر یہ کس کی ادا لے گئی مجھے

میں بے خبر تھی وقت کی رفتار سے حیات
پھر بھی وہ آج ساتھ بہا لے گئی مجھے

(۳)

خوشبو سی کوئی آئے تو لگتا ہے کہ تم ہو
شیشہ کہیں ٹکرائے تو لگتا ہے کہ تم ہو
احساسِ محبت سے کسی گوشۂ دل میں
جب چوٹ ابھر آئے تو لگتا ہے کہ تم ہو
پُر کیف ہوا میں جو کسی پیڑ کے نیچے
آنچل مرا لہرائے تو لگتا ہے کہ تم ہو
چھونے سے کبھی بادِ صبا کے مرے تن میں
اک برق سی لہرائے تو لگتا ہے کہ تم ہو
سر رکھ کے جو پتھر پہ کبھی راہِ الم میں
کچھ نیند سی آجائے تو لگتا ہے کہ تم ہو
جب شامِ ملاقات پڑوسی کے مکاں سے
آواز کوئی آئے تو لگتا ہے کہ تم ہو
جب شانہ بھی کرنے نہ اٹھے ہاتھ ہمارا
اور زلف سنور جائے تو لگتا ہے کہ تم ہو

(۴)

بدلی ہوئی ہے کیسی فضائے چمن تمام
خوں میں نہا رہے ہیں گل و یاسمن تمام

کیوں کر لباسِ فاخرہ پہنے ہوئے ہو تم
لاشیں پڑی ہوئی ہیں ابھی بے کفن تمام

دشتِ جنوں کی راہ بھی محدود ہو گئی
کیا مجھ پہ ہو گیا مرا دیوانہ پن تمام

ہیں کوچۂ جفا میں صلیبیں سجی ہوئی
ہوگا کبھی نہ قصۂ دار و رسن تمام

احساں اٹھائے گا نہ رفوگر کا وہ کبھی
خود جس نے تار تار کیا پیرہن تمام

دنیا میں ایسے قطرۂ خوں کا بدل نہیں
سیراب جس نے کر دیے دشت و دمن تمام

بھولے نہ تھے حیات وہ ہجرت کا حادثہ
مقتل بنی ہے پھر سے فضائے وطن تمام

خاؔر زتشی دہلوی

۱

دنیا کے ہیں نہ دین کے، دلبر کے ہو گئے
ہم دل سے کلمہ گو کسی کافر کے ہو گئے

اٹھے نہ بیٹھ کر، کبھی کوئے حبیب سے
اُس در پہ کیا گئے کہ اُسی در کے ہو گئے

اے چشمِ یار مان گئے تیرے سحر کو
دل دے کے معتقد ترے منتر کے ہو گئے

ہم عرضِ حال کر نہ سکے، اف رے رعبِ حسن
جاتے ہی ان کے سامنے پتھر کے ہو گئے

اے خاؔر، دل جگر پہ ہی قابو نہیں رہا
ہم سے خلاف غیر تو کیا، گھر کے ہو گئے

۲

اُسی کی داستانیں ہیں اسی کی قصّہ خوانی ہے
وہ لطفِ خاص جو مجھ پر ترا، اے یارِ جانی ہے
نہ جا! ظالم ابھی تو تشنۂ دیدار ہیں آنکھیں
ذرا دم لے ابھی تو داستانِ غم سنانی ہے
محبت زلف کا آسیب، جادو ہے نگاہوں کا
محبّت فتنۂ محشر، بلائے ناگہانی ہے
کبھی حسرت کا نوحہ ہے، دلِ مرحوم کا ماتم
بہ الفاظِ دگر یہ شعر خوانی سوز خوانی ہے
گھرانا ہے ہمارا داغ کا ہم دلّی والے ہیں
زمانے میں مسلّم خار اپنی خوش بیانی ہے

۳

بہرصورت ہیں ہم شیرینیٔ گفتار کے صدقے
ترے اقرار کے صدقے، ترے انکار کے صدقے

خوشا ذوقِ طلب، اِس حسرتِ دیدار کے صدقے
ہوئے ہیں بام و در کے روزن و دیوار کے صدقے

نوازش ہو، نوازے گر نگاہِ لطف سے اس کو
ترا بیمار تیری نرگسِ بیمار کے صدقے

قدم لے کر، کلیجے سے لگاتے ہیں کبھی اس کو
کبھی ہوتے ہیں ہم چشم و لب و رخسار کے صدقے

جہانِ آرزو میں حُسن کا بھی نام ہو جائے
مزہ آجائے وہ گل بھی اگر ہو خار کے صدقے

(۴)

دیکھتا رہتا ہوں میں تیری غزالی آنکھیں
دیکھ تو تُو بھی ذرا میری سوالی آنکھیں
چشمِ آہو سے نہ نرگس سے ہے تشبیہہ درست
ہیں مثال آپ ہی وہ اپنی نرالی آنکھیں
برہمیٔ حسن کو کچھ اور جِلا دیتی ہے
وہ جمالی ترا چہرہ ، وہ جلالی آنکھیں
آ کے ہر روز تصور میں بنا جاتی ہے
ایک رنگین سی تصویر ، خیالی آنکھیں
خط پڑھے یا نہ پڑھے، آئے نہ آئے وہ شوخ
خارکیوں بھیج نہ دیں دیکھنے والی آنکھیں

خالدؔ محمود

(۱)

آگیا پیروں میں چہرا ٹوٹ کر
گر گیا ہاتھوں سے شیشا ٹوٹ کر

وہ سدا سے مل رہا تھا ٹوٹ کر
آج بچھڑا ہے تو بچھڑا ٹوٹ کر

جگمگاتا تھا تو کتنا دور تھا
بن گیا تقدیر تارا ٹوٹ کر

خشک سالی کھا گئی افراد کو
بہہ گئے گھر بھی جو برسا ٹوٹ کر

"ہر زماں پیشِ نظر ہشیار باش"
شاخ سے گرتا ہے پتّا ٹوٹ کر

ریت کی دیوار سے کیا فائدہ
عمر کا رہتا ہے رشتا ٹوٹ کر

خالدِؔ بینا کی بینائی گئی
گر گیا آنکھوں سے چشما ٹوٹ کر

(۲)

آنکھوں میں دھوپ دل میں حرارت لہو کی تھی
آتش جوان تھا تو قیامت لہو کی تھی
زخمی ہوا بدن تو وطن یاد آگیا
اپنی گرہ میں ایک روایت لہو کی تھی
خنجر چلا کے مجھ پہ بہت غمزدہ ہوا
بھائی کے ہر سلوک میں شدّت لہو کی تھی
کوہِ گراں کے سامنے تیشے کی کیا بساط
عہدِ جنوں میں ساری شرارت لہو کی تھی
خالدؔ ہر ایک غم میں برابر شریک تھا
سارے جہاں کے بیچ رفاقت لہو کی تھی

۳

شاید کہ مر گیا مرے اندر کا آدمی
آنکھیں دکھا رہا ہے برابر کا آدمی

سورج، ستارے، کوہ، سمندر، فلک، زمیں
سب ایک کر چکا ہے یہ گز بھر کا آدمی

آواز آئی پیچھے پلٹ کر تو دیکھیے
پیچھے پلٹ کے دیکھا تو پتھر کا آدمی

اِس گھر کا ٹیلیفون ابھی جاگ جائے گا
صاحب کو لے کے چل دیا دفتر کا آدمی

ذرّے سے کم بساط پہ سورج نگاہیاں
خالد بھی اپنا ہے تو مقدر کا آدمی

خاورشجاع خاور

۱

سامان میرا عرشِ بریں پر پڑا رہا
میں بد دماغ اور کہیں پر پڑا رہا
مایوسیوں نے گھیر لیا سارا آسماں
رات آرزو کا چاند زمیں پر پڑا رہا
اس کو خدائیوں کی سزا مل گئی مگر
سجدوں کا داغ میری جبیں پر پڑا رہا
کیا بات تھی کہ ملتے رہے دوسروں کو تاج
پھر بھی ہُما کا سایہ ہمیں پر پڑا رہا
خانہ بدوشیوں کا ستایا ہوا تھا وہ
دو گز زمیں ملی تو وہیں پر پڑا رہا

(۲)

لکھنے لگے ہیں نام ہم اپنا لقب کے ساتھ
تھوڑا سا اختلاف ضروری ہے سب کے ساتھ

رختِ سفر میں اتنے نہ لو خواب اب کے ساتھ
دو ایک خواب تو ہیں چلو خیر سب کے ساتھ

اس کشمکش میں جان گنوانا فضول ہے
سمجھوتہ کر لیا ہے میاں روز و شب کے ساتھ

کس منہ سے شاہِ وقت پہ تنقید ہم کریں
ہم خود سلام کرتے ہیں اُس کو ادب کے ساتھ

اسلوب سے زیادہ کوئی شے نہیں عزیز
لکھتا ہوں مدح میں بھی مگر اپنے ڈھب کے ساتھ

اس کا بیان ہم نے غزل میں کیا تو ہے
وہ سلسلہ کہاں ہے مگر چشم و لب کے ساتھ

فرصت ملے تو دن کے اندھیروں کی سوچیئے
تاریکیاں تو روز ہی آئیں گی شب کے ساتھ

کچھ دوستوں کو پوچھتی پھرتی ہے پھر ہوا
کہہ دو شجاع چھوڑ چکے وہ تو کب کے ساتھ

(۳)

پہنچا حضورِ شاہ ہر اک رنگ کا فقیر
پہنچا نہیں جو، تھا وہی پہنچا ہوا فقیر
وہ وقت کا غلام تو یہ نام کا فقیر
کیا بادشاہِ وقت میاں اور کیا فقیر
مندرجہ ذیل لفظوں کے معنی تلاش کر
درویش، مست، صوفی، قلندر، گدا، فقیر
ہم کچھ نہیں تھے شہر میں، اس کا ملال ہے
اک شخص شہریار تھا اور ایک تھا فقیر
کیا دَور آگیا ہے کہ روزی کی فکر میں
حاکم بنا ہوا ہے اک اچھا بھلا فقیر
اس کشمکش میں کچھ نہیں بن پاؤگے شجاع
یا شہریار بن کے رہو اور یا فقیر

(۴)

حالت اُسے دل کی نہ دکھائی، نہ بیاں کی
خیر اس نے نہ کی بات، تو ہم نے بھی کہاں کی
ایک ایک ستمگار کو قدموں میں گرا کر
کل ہم نے تصوّر کی زباں خوب رواں کی
اللہ کا بندہ کوئی گھر سے نہیں نکلا
تفسیر سبھی کرتے رہے کون و مکاں کی
ایک اس کا سراپا ہے کہ بس میں نہیں آتا
کیا ہو گئی حالت مرے اندازِ بیاں کی
تھا شہرِ تصور میں عجب خوف کا عالم
تشبیہ بھی لفظوں کے دریچے سے تو جھانکی
طوفانِ معانی مرے ہر لفظ کے پیچھے
تیزی ہے ہر اک شعر میں دلّی کی زباں کی
صحرائے عدم کا بھی شجاع اپنا مزہ ہے
تم سوچتے رہتے ہو فقط گلشنِ جاں کی

(۵)

ارمان پورے ہو گئے دل بھر گیا میاں
اس زندگی کے واسطے میں مر گیا میاں
اگلی صفوں میں امن پسندی کا شور ہے
تنہا جہاد کیجیے، لشکر گیا میاں
ہوش و حواس دوستی کرتے ہیں، اس لیے
میں دشمنوں کے بیچ میں پی کر گیا میاں
قدر دں کی بات اور ہے باقی تو ہر طرح
یہ سال پچھلے سال سے بہتر گیا میاں
سمجھوتہ کر لیا ہے شہنشاہ وقت سے
اچھا ہے روز روز کا چکّر گیا میاں
نورِ اندرونِ ذات سے لینے گیا تو تھا
تاریکی اس قدر تھی کہ میں ڈر گیا میاں
اب یا تو محتسب کو بھی باغی کروں گا میں
یا پھر مرے بھی ہاتھ سے ساغر گیا میاں
مشکل پڑے گی کل کے مورّخ کو، دیکھنا
میں گھر گیا نہ آج سفر پر گیا میاں

درشن سنگھ

(۱)

خاک سے تا بہ کہکشاں ہم نے تو جب کیا سفر
عشق ملا قدم قدم حسن ملا نظر نظر
کیسا خیال گم رہی کیسا ہراس دشت و در
شوق ہے تیرا رہنما یاد ہے تیری ہم سفر
ہم نے بھی جا کے دیکھ لی اہلِ خرد کی رہ گزر
سوئے ہوئے سے راہ رو، کھوئے کھوئے سے راہبر
کوئی ملے تو پوچھ لیں موسمِ گل تو ہے، مگر
گردِ خزاں پڑی ہے کیوں آئینۂ بہار پر
دل سے نکل کے ہر صدا کیوں نہ دلوں میں ڈوب جائے
ساز مرا لطیف ہے، نغمہ ترا لطیف تر
صبحِ ازل سے میں چلا شامِ ابد تک آ گیا
عمرِ درازِ شوق ہے میری حیاتِ مختصر
اپنے ہی دوست کی تو ہیں جتنی ہیں یہ نشانیاں
دیر ملے تو سر جھکا، کعبہ ملے سلام کر
حسن سے بھی سوا ہے کچھ عشق کی روشنی ہمیں
وہ ہے چراغِ انجمن، یہ ہے چراغِ رہ گزر
چشمِ کرم گراں سہی، چشمِ کرم نہ کیجیے
ہاں مگر اک نگاہِ ناز درشنؔ خستہ حال پر

۲

کسی کی شامِ سادگی، سحر کا رنگ پا گئی
صبا کے پا تو تھک گئے، مگر بہار آ گئی

چمن کی جشن گاہ میں، اداسیاں بھی کم نہ تھیں
جلی جو کوئی شمعِ گل، کلی کا دل بجھا گئی

بتانِ رنگ رنگ سے بھرے تھے بت کدے مگر
تری ادائے سادگی مری نظر کو بھا گئی

چراغِ شب کے حال پر ٹپک رہے تھے اشکِ تر
بڑی ستم ظریف تھی سحر جو مسکرا گئی

نگاہِ ساقیِ ازل عجب کرشمہ ساز تھی
جنوں کی آنکھ کھل گئی خرد کو نیند آ گئی

غریبِ دشت کے لیے انیسِ وقت کون تھا
بس ایک شامِ بےکسی گلے سے جو لگا گئی

خزاں کا دور ہے مگر، وہ اس ادا سے آئے ہیں
بہار درشنِ حزیں کی زندگی پہ چھا گئی

(۳)

ایسی نظر فروز تھی ، بزمِ گہِ نگارِ فن
میری نظر کو بھا گئی اہلِ نظر کی انجمن
نام ہے آدمی تو کیا اصل میں روحِ عشق ہوں
ساری زمیں ہے میرا گھر سارا جہاں مرا وطن
اہلِ دوئی کو عشق سے وحدتِ کیفیت ملی
بادہ کشوں میں بٹ گیا پیرِ مغاں کا پیرہن
پرتوِ عینِ ذات ہیں، روشنیاں صفات کی
اصل میں دونوں ایک ہیں، شیخ ہو وہ کہ برہمن
کتنے چمن کھلا گئیں آبلہ پائیاں مری
یاد رہے گا دشت کو میرے جنوں کا بانکپن
نقش و نگارِ حرف و لب، وجہِ کشش سہی، مگر
خونِ جگر سے ہم نفس ہے یہ بہارِ فکر و فن
درشنِ خود نگر کو وہ جام عطا ہو ساقیا
پی کے جسے مٹا سکے دل سے تمیزِ ما و من

(۴)

ہوش والوں کو سراسیما و حیراں دیکھا
تیرے دیوانے کو ہر حال میں شاداں دیکھا

ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں جو اٹھائیں شبِ غم
تو ستاروں کے قریب آپ کو خنداں دیکھا

غمِ دنیا، غمِ ہستی، غمِ جاناں، غمِ دل
کتنے ہی کانٹوں سے الجھا ہوا داماں دیکھا

سب یہاں وحدتِ جلوہ کے پرستار ملے
تیری محفل میں نہ ہندو، نہ مسلماں دیکھا

تیرے دیوانے نے ٹھکرا دیے دونوں عالم
اہلِ ظاہر نے اُسے بے سر و ساماں دیکھا

آنکھ والوں کی شہادت بھی شہادت ہے کوئی
آنکھ والوں نے تجھے تا حدِ امکاں دیکھا

رُوح مضطر رہی جن میں وہ ملے شیش محل[1]
رُوح کو امن ملا جس میں وہ زنداں دیکھا

کٹ گئی عمرِ محبت کے سفر میں لیکن
صبح کو شامِ تمنا سے گریزاں دیکھا

ایک درشن ہی ملا اوروں کا غم خوار ہمیں
اپنے غم میں تو زمانے کو پریشاں دیکھا

---

[1] شیش محل سے مراد عیش و عشرت کی زندگی اور زنداں سے مراد محنت کی زندگی ہے۔
(شاعر)

(۵)

جو خود کو زیرِ حلقۂ گرداب لے گیا
اس بحر سے وہ گوہرِ نایاب لے گیا
عرشِ عظیم تک دلِ بیتاب لے گیا
پھر اُس کے بعد شوق کا سیلاب لے گیا
خاموش ہوں، خرابۂ امروز دیکھ کر
ماضی مرے جہان کا ہر خواب لے گیا
اے جانِ خواب، تیرے شبستانِ خواب سے
جو بھی گیا، وہ دیدۂ بے خواب لے گیا
لکھّی تھی جس میں عہدِ محبّت کی داستاں
کوئی کتابِ دل کا وہی باب لے گیا
بحرِ بلا میں کوئی نہیں اب مرے سوا
ہر آشنا کو وقت کا سیلاب لے گیا
انساں زمیں کو دے نہ سکا آشتی کا نور
خود کو اگرچہ تا سرِ مہتاب لے گیا
پائے نہ کیوں شہیدِ وفا عمرِ جاوداں
وہ اپنے ساتھ زیست کے اسباب لے گیا
درشن ہمارے پاس کہاں اب متاعِ دل
اک دلستاں وہ دولتِ نایاب لے گیا

رازؔ : راج نرائن راز

۱

اپنے کشکول میں سورج ہے کہ عالی ٹھہرے
دیکھ اے تیرہ شبی! ہم ترے والی ٹھہرے

ہر نیا نقش کہ مانگے ہے دھنک رنگ دھواں
میں نے پیکر جو تراشے تھے، وبالی ٹھہرے

آنکھ میں نشۂ مسلسل نئے آفاق کا ہے
کیا قیامت کہ ہمیں دامنِ خالی ٹھہرے

ہر شجر شاخ پہ پھل پھول تھے کڑوے، بے رنگ
ہر شجر شاخ سے ہم لوگ سوالی ٹھہرے

میں نے دیکھی ہے، دبے پاؤں سحر آتی ہوئی
مرگ آثار عناصر بھی زوالی ٹھہرے

آنکھ جگمگ سی، لرزتے ہوئے لب، گال شفق،
کیسے کہہ دوں کہ یہ اصنام خیالی ٹھہرے

رازؔ کس شے کی مہک چار طرف پھیل گئی
ہاں مہک شاخِ ہنر کی ہے، مثالی ٹھہرے

(۲)

خاموش موج موج! سمندر صدا کا، ہوں
اظہار آپ سوچیے، کس کی ادا کا ہوں
شبنم صفت میں سایا گھنیری گھٹا کا ہوں
میں پہلا حرف صبح کی پہلی دعا کا ہوں
میں جو چلوں تو پھول کھلاؤں طرف طرف
خوشبو: تمام لطف! میں جھونکا ہوا کا ہوں
مجھ سے نگار و نقش میں عالم عجب، سنئے
گوری ہتھیلیاں ہیں! میں پتّہ حنا کا ہوں
چاندی مرے وجود پہ بکھری ہوئی ہے راز
میں ایک عکس آئینہ ارتقا کا ہوں

(۳)

موجِ انفاس کو روانی دے
رات کوئی تو داستانی دے
آنکھ منظر کشا، نئے پل پل
اپنے ہونے کی کچھ نشانی دے
حمد لکھوں سنہرے لفظوں میں
آبِ زرّیں دے، زر بیانی دے
آٹھواں رنگ جس کا عنواں ہو
ایسی تازہ، نئی کہانی دے
نغمے، طائر، شجر زمیں پیوست
تو اُٹھیں موسم آسمانی دے
کتنی گرمی لہو میں ہے، دیکھوں
مرحلہ کوئی امتحانی دے
میں جسے راز کہہ سکوں اپنا
کوئی ہم خواب، کوئی ثانی دے

۴

باہم سلوکِ خاص کا اک سلسلا بھی ہے
وہ کون ساتھ ساتھ ہے! لیکن جدا بھی ہے
برگِ خزاں کی زرد سی تحریر ہے، مگر
دشتِ شفق میں پھول سنہرا کِھلا بھی ہے
پانی میں اِک چراغ کی لَو، نم، گداز، سُرخ
پانی میں کوئی عکس عجب زرد سا بھی ہے
اک نشۂ خواب، دھوپ شفق چاندنی، سراب
کھڑکی گماں کی، سامنے منظر نیا بھی ہے
آؤ بنائیں کشتیاں کاغذ کی چل کے راز
پُروا چلی ہے، جھوم کے بادل اُٹھا بھی ہے

۵

سوچیے! گرمیٔ گفتار کہاں سے آئی
لب بہ لب خواہشِ اظہار کہاں سے آئی
کس حنا ہاتھ سے آنگن ہے معطر اتنا
وقتِ خوش، ساعتِ بیدار کہاں سے آئی
ہاں یہ ممکن ہے، نیا موڑ ہو پھولوں جیسا
چُپ یہ پازیب کی جھنکار کہاں سے آئی
خون میں نشۂ اظہار کا خنجر پیوست
درمیاں چپ کی یہ تلوار کہاں سے آئی
ہم خرابے کے مسافر ہیں ہمارے دل میں
آرزوئے در و دیوار کہاں سے آئی
میرا اندازہ کہ سب دوست یہاں ہیں، لیکن
بوئے، کم ظرفیِ اغیار کہاں سے آئی
سوچتا ہوں کہ خوش انداز دلوں میں اے راز
شورشِ خوئے دلِ آزار کہاں سے آئی

روشؔ صدیقی

۱

وفا کو پردۂ محرومیٔ دوام کیا
تمام عمر ترے غم کا احترام کیا

انھیں نقاب اٹھانا بھی ہو گیا دشوار
کچھ اس طرح سے نگاہوں نے اژدہام کیا

خوشا وہ دردِ محبت کہ جس نے خود بڑھ کر
دلِ حزیں کی تسلّی کا اہتمام کیا

رہِ طلب میں کہاں امتیازِ دیر و حرم
جہاں کسی نے صدا دی وہیں قیام کیا

مزاجِ حسن کم آمیز، عشق کم اظہار
فسانۂ غمِ پنہاں کو کس نے عام کیا

خمارِ تشنگیٔ شوق کم نہ تھا اے دل
تمام عمر عبث انتظارِ جام کیا

دلِ روشؔ کو ترے انتظار نے اے دوست
چراغ صبح کیا آفتابِ شام کیا

(۲)

زندگی کیا ہے! حجابِ رخِ امکاں ہونا
پردۂ خاک میں چھپ چھپ کے گل افشاں ہونا

عالمِ حیرتِ نظارۂ جاناں کی قسم
نگہِ شوق کی معراج ہے حیراں ہونا

عشرتِ دل نہیں اسبابِ طرب پر موقوف
آنسوؤں کو بھی تو آتا ہے غزل خواں ہونا

پرتوِ شوق ابھی حائلِ تنہائی ہے
ابھی کچھ اور ہے دل کو مرے ویراں ہونا

سب حجابات ہیں اسرارِ خود آگاہی کا
کبھی قطرہ کبھی دریا کبھی طوفاں ہونا

آخرِ شب یہ ستاروں سے صدا آتی ہے
قسمتِ خوابِ تمنّا ہے پریشاں ہونا

آدمیت ہے فرشتوں سے بہت دور روشن
واعظِ شہر کو دشوار ہے انساں ہونا

۳

رگوں میں شعلۂ حسرت نہ برقِ آرزو دل میں
کہاں سے روشنی ہو ان خرد مندوں کی محفل میں

ابھی اے ہم سفر حدِّ نظر سے دور ہے منزل
نہ کھو جاتا کہیں نزدیکیٔ آثارِ منزل میں

سفینہ اہلِ حق کا یوں بھی طوفانوں سے گزرا ہے
کہ موجیں سر جھکا کر چھپ گئیں دامانِ ساحل میں

مزاجِ شرک سے کیا واسطہ اہلِ محبت کو
زبانِ عشق پر وہ بات آتی ہے جو ہو دل میں

عجب عالم گزرتا جا رہا ہے سننے والوں پر
سکوتِ ناز کا بھی رنگ ہے افسانۂ دل میں

روشن اس ضد کو کیا کہیے کہ جب محفل میں ہم پہنچے
وہی غارت گرِ محفل نہیں تھا اپنی محفل میں

(۴)

حسنِ روپوش مری حسرتِ روپوش میں آ
یہی آغوشِ ازل ہے اسی آغوش میں آ
قصۂ طور کا عنوان بدل دے دنیا
کبھی اس طرح مری انجمنِ ہوش میں آ
دیکھنا گر ہے جمالِ رخِ لیلائے فراق
زلف بردوش مری شامِ سیہ پوش میں آ
میری دنیائے محبت بھی کبھی ہو آباد
چشمِ حیراں، دلِ ویراں، لبِ خاموش میں آ
تیرے احساسِ تغافل کو خبر تک بھی نہ ہو
یوں بھی اک روز مری خلوتِ خاموش میں آ
اپنی بیگانہ نگاہی کا اثر دیکھ تو لے
رہزنِ ہوش ذرا تمکنتِ ہوش میں آ
تجھ پہ قربان مرے دل کی ہر اک بے خبری
آ، اسی منزلِ احساس فراموش میں آ
کب تک اے حسن پرستارئ آئینِ حجاب
جانِ آغوش کبھی صورتِ آغوش میں آ
عشق وابستۂ زنجیر جنوں کب ہے روش
حسنِ خودبیں کی تمنا ہے تو خود ہوش میں آ

۵

محبّت کی جہاں بانی کے دن ہیں
زمیں پر خلد سامانی کے دن ہیں

یہ ہے دورِ جلال ابنِ آدم
نہ سلطانی نہ خاقانی کے دن ہیں

جو ہیں اپنی جگہ خورشید بنیاد
اب اُن ذرّوں کی تابانی کے دن ہیں

ارادوں کی بلندی اوج پر ہے
حوادث کی پشیمانی کے دن ہیں

محبّت جلوہ گر ہے جھونپڑوں میں
اب اس دولت کی ارزانی کے دن ہیں

زوال آمادہ ہے تعمیرِ اوہام
کمالِ فکرِ انسانی کے دن ہیں

قصیدے بادشاہوں کے ہوئے ختم
محبّت کی غزل خوانی کے دن ہیں

تقدّس ہو فرشتوں کو مبارک
روِش اب خلقِ انسانی کے دن ہیں

زبیر رضوی

۱

کئی کوٹھے چڑھے گا وہ کئی زینوں سے اترے گا
بدن کی آگ لے کر شب گئے پھر گھر کو لوٹے گا

گزرتی شب کے ہونٹوں پر کوئی بے ساختہ بوسہ
پھر اُس کے بعد تو سورج بڑی تیزی سے چمکے گا

ہماری بستیوں پر دُور تک پھیلا ہوا بادل
ہوا کا رُخ اگر بدلا تو صحراؤں پہ برسے گا

غضب کی دھار تھی اک سائباں ثابت نہ رہ پایا
ہمیں یہ زعم تھا بارش میں اپنا سر نہ بھیگے گا

میں اُس محفل کی روشن ساعتوں کو چھوڑ کر گم ہوں
اب اتنی رات کو دروازہ اپنا کون کھولے گا

مرے چاروں طرف پھیلی ہے حرف و صوت کی دنیا
تمھارا اس طرح ملنا کہانی بن کے پھیلے گا

پُرانے لوگ دریاؤں میں نیکی ڈال آتے تھے
ہمارے دور کا انسان نیکی کر کے چیخے گا

(۲)

بچھڑتے دامنوں میں پھول کی کچھ پتیاں رکھ دو
تعلق کی گرانباری میں تھوڑی نرمیاں رکھ دو
بھٹک جاتی ہیں تم سے دور چہروں کے تعاقب میں
جو تم چاہو مری آنکھوں پہ اپنی انگلیاں رکھ دو
برستے بادلوں سے گھر کا آنگن ڈوب تو جائے
ابھی کچھ دیر کاغذ کی بنی یہ کشتیاں رکھ دو
دھواں سگرٹ کا بوتل کا نشہ سب دشمنِ جاں ہیں
کوئی کہتا ہے اپنے ہاتھ سے یہ تلخیاں رکھ دو
بہت اچھا ہے یارو محفلوں میں ٹوٹ کر ملنا
کوئی بڑھتی ہوئی دوری بھی اپنے درمیاں رکھ دو
نقوشِ خال و خد میں دِل نوازی کی ادا کم ہے
حجاب آمیز اِن آنکھوں میں تھوڑی شوخیاں رکھ دو
ہمیں پر ختم کیوں ہے داستانِ خانہ ویرانی
جو گھر صحرا نظر آئے تو اس میں بجلیاں رکھ دو

۲

اپنے گھر کے در و دیوار کو اونچا نہ کرو
اتنا گہرا مری آواز سے پردا نہ کرو

کل نہ ہو یہ کہ مکینوں کو ترس جائے یہ گھر
دل کے آسیب کا ہر ایک سے چرچا نہ کرو

جو نہ اک بار بھی چلتے ہوئے مڑ کے دیکھیں
ایسی مغرور تمناؤں کا پیچھا نہ کرو

ہو اگر ساتھ کسی شوخ کی خوشبوئے بدن
راہ چلتے ہوئے مہ پاروں کو دیکھا نہ کرو

عشق آثار زلیخاؤں کی اس بستی میں
صاحبو پاکئ داماں پہ بھروسا نہ کرو

تازہ غزلوں کو رسائل میں نہ چھپواؤ زبیر
کوئی کہتا ہے مرے نام کو رسوا نہ کرو

(۴)

بارش نہیں ہوا نہیں بادل گھٹا نہیں
اب دل میں تیری یاد کا موسم ہرا نہیں

دو چار صحبتوں میں اسے اور دیکھ لیں
وہ شخص پہلی بار تو اچھا لگا نہیں

ہر راہ پر تھے کانچ کے ٹکڑے بچھے ہوئے
ہم اس طرح چلے کوئی شیشہ چبھا نہیں

مجھ سے بچھڑ گیا وہ ہرے جنگلوں کے بیچ
میں کس طرف کو جاؤں کوئی راستا نہیں

ان قربتوں نے اور بھی تنہا سا کر دیا
اب درمیاں ہمارے کوئی فاصلا نہیں

سب شور دستکوں کا ہواؤں نے پی لیا
سنسان ہر گلی ہے کوئی جھانکتا نہیں

۵

دل کے تار میں یادوں کے اب آہو بھی نہیں
آئینہ مانگیں جو ہم سے وہ پری رو بھی نہیں
دشتِ تنہائی میں آواز کے گھنگھرو بھی نہیں
اور ایسا بھی کہ سناٹے کا جادو بھی نہیں
زندگی جن کی رفاقت پہ بہت نازاں تھی
ان سے بچھڑی تو کوئی آنکھ میں آنسو بھی نہیں
تلخیاں نیم کے پتوں کی ملی ہیں ہر سو
یہ مرا شہر کسی پھول کی خوشبو بھی نہیں
جانے کیا سوچ کے ہم رک گئے ویرانوں میں
پرتو رخ بھی نہیں سایۂ گیسو بھی نہیں
حسنِ امروز کو تشبیہوں میں تولیں کیسے
اب وہ پہلے سے خمِ کاکل و ابرو بھی نہیں
ہم نے پائی ہے ان اشعار پہ بھی داد زبیرؔ
جن میں اس شوخ کی تعریف کے پہلو بھی نہیں

ساحرؔ ہوشیارپوری

۱

تیرے محل میں کیسے بسر ہو اس کی تو گیرائی بہت ہے
میں گھر کی انگنائی میں خوش ہوں میرے لیے انگنائی بہت ہے

اپنی اپنی ذات میں گم ہیں، اہلِ دل بھی، اہلِ نظر بھی
محفل میں دل کیوں کر بہلے، محفل میں تنہائی بہت ہے

دشمن سے گھبرانا عبث ہے، غیر سے ڈرنا بھی لاحاصل
لنکا ڈھانے کو گھر کا بھیدی، ایک بھبھیشن بھائی بہت ہے

اپنی دھرتی ہی کے دکھ سکھ ہم شعروں میں کہتے ہیں
ہم کو ہمالہ سے کیا مطلب، اس کی تو اونچائی بہت ہے

پرسشِ غم کو خود نہیں آئے، اُن کا مگر پیغام تو آیا
ہجر کی رُت میں، جانِ حزیں کو دور کی یہ شہنائی بہت ہے

دل کی کتابیں پڑھ نہیں سکتا، لیکن چہرے پڑھ لیتا ہوں
ڈھلتی عمر کی دھوپ میں ساحرؔ اتنی بھی بینائی بہت ہے

برسوں میں اک جوگی لوٹا جوت جگائی جنگل میں
کہنے لگا اے بھولے شنکر شہروں میں مہنگائی بہت ہے

۲

دیکھا رنگ رنگیلا پتھّر
گھونگھٹ میں شرمیلا پتھّر
عشق میں ٹھوکر لگنی ہی تھی
بن گیا ایک وسیلا پتھّر
سینہ تانے، رستہ روکے
ضدّی، شوخ، ہٹیلا پتھّر
خون میں تڑپیں ساری پرتیں
ہم نے اک دن چھیلا پتھّر
چکھ کر آخر دیکھ لیا تا
بے رس، تلخ، کسیلا پتھّر
ساتھ رہے اور ہاتھ نہ آئے
لچکیلا، تھرکیلا، پتھّر
مذہب سے کیا فطرت بدلے
مریم، زہرہ، شیلا، پتھّر
جی چاہے ہے سیس نواؤں
سندر، شیام، سجیلا، پتھّر
ساحر دنیا کے سینے میں
دل ہے، یا برفیلا پتھّر

(۴)

جس کے من کو بھائے سانپ
کیوں اس کو ڈس جائے سانپ
ان کو دودھ پلاتا ہوں
جیسے ہوں ماں جائے سانپ
اِن کی دو ہی قسمیں ہیں
اپنے اور پرائے سانپ
کتنی تلخ حقیقت ہے
انساں کے ہم سائے سانپ
جوبن، مستی، شرم، حیا
کیا کیا روپ دکھائے سانپ
کتنے ہیں پابندِ وفا
نام لیا اور آئے سانپ
صبح سے چھپ کر بیٹھے تھے
سانجھ ہوئی اور آئے سانپ
راہ تکت ہیں جوگی کی
اپنا پھن پھیلائے سانپ
ساحر تیرے شعروں میں
کیسے کیسے آئے سانپ

۴

سر پہ گاگر، ناک میں نتھ، پاؤں میں جھانجھر کہاں
ڈھونڈتے ہو شہر میں تم گاؤں کا منظر کہاں

دو قدم پر وہ رہی منزل کی دل کش روشنی
دیکھیے آ کر لگی ہے پاؤں کو ٹھوکر کہاں

رُو بہ رُو آیا تو میری روح تک تھرّا گئی
چھپ کے بیٹھا تھا یہ چہرہ جسم کے اندر کہاں

ہے سُلگتی دھوپ کا اک دشت تا حدِّ نظر
سر چھپانے کے لیے اب چھاؤں کی چادر کہاں

اونچے محلوں میں نہ کر انسانیت کی جستجو
جذبۂ مخلص کہاں، دیوارِ سیم و زر کہاں

یوں تو ہیں خنجر ہزاروں قتل گاہِ شوق میں
خود تڑپ کر جو گلے لگ جائے وہ خنجر کہاں

خود سری و گُم رہی کے آتشیں طوفان میں
ساحرِ خود دار اب محفوظ تیرا گھر کہاں

۵

ان کی فرقت کا اس قدر احساس
کتنا میلا ہے چاندنی کا لباس
لاکھ سیراب دید ہوں آنکھیں
بجھ سکے گی مگر نہ دل کی پیاس
مجھ کو خوشیوں کی کیا ضرورت ہے
اک زمانے کے غم ہیں میرے پاس
آرزوئے فرار کون کرے
بے قراری ہی آ گئی ہے راس
ہائے وہ کیسے لوگ ہوتے ہیں
جن کو ہوتا نہیں وفا کا پاس
کیا ہوئے ہیں وہ دور نظروں سے
نظر آتی ہے کائنات اداس
ہم کہیں کس سے داستانِ دل
کوئی بھی تو نہیں مزاج شناس
دیکھ کر میرا اہتمامِ حیات
موت کا چہرہ ہو گیا ہے اُداس
فکرِ انجام کیوں کروں ساحرؔ
مستیٔ عشق آ گئی ہے راس

ساغر نظامی

(۱)

گیسو کو ترے رخ سے بہم ہونے نہ دیں گے
ہم رات کو خورشید میں ضم ہونے نہ دیں گے

یہ درد تو آرامِ دو عالم سے سوا ہے
اے دوست ترے درد کو کم ہونے نہ دیں گے

مفہوم بدل جائے گا تسلیم و رضا کا
اب ہم سرِ تسلیم کو خم ہونے نہ دیں گے

صرصر کو سکھائیں گے لطافت کا قرینہ
پھولوں پہ ہواؤں کے ستم ہونے نہ دیں گے

اے کاتبِ تقدیر ہماری بھی رضا پوچھ
یوں نالۂ تقدیر رقم ہونے نہ دیں گے

جب تک ہے دلِ زار میں اک قطرۂ خوں بھی
کم مرتبۂ لوح و قلم ہونے نہ دیں گے

جو زندہ و حسّاس بتوں کی ہے امانت
اس سجدے کو ہم نذرِ حرم ہونے نہ دیں گے

اُٹھ جائیں گے جوں یادِ صبا بزم سے تیری
تجھ کو بھی خبر تیری قسم ہونے نہ دیں گے

لاکھوں کا سہارا ہے یہی جام سفالیں
ساغر کو کبھی ساغرِ جم ہونے نہ دیں گے

(۲)

ہم آنکھوں سے بھی عرضِ تمنّا نہیں کرتے
مبہم سا اشارہ بھی گوارا نہیں کرتے

حاصل ہے جنھیں دولتِ صد آبلہ پائی
وہ شکوۂ بے رنگیِ صحرا نہیں کرتے

صد شکر کہ دل میں ابھی اک قطرۂ خوں ہے
ہم شکوۂ بے رنگیِ دنیا نہیں کرتے

مقصودِ عبادت ہے فقط دید نہیں ہے
ہم پوجتے ہیں آپ کو دیکھا نہیں کرتے

کافی ہے ترا نقشِ قدم چاہے جہاں ہو
ہم پیرویِ دیر و کلیسا نہیں کرتے

سجدہ بھی ہے منجملہ اسبابِ نمائش
جو خود سے گزر جاتے ہیں سجدا نہیں کرتے

جن کو ہے تری ذات سے یک گونہ تعلق
وہ تیرے تغافل کی بھی پروا نہیں کرتے

یہ لمحۂ حاضر تو ہے کونین کا حاصل
ہم حال کو نذرِ غمِ فردا نہیں کرتے

ہر آگ کو پہلو میں چھپا لیتے ہیں ساغرؔ
ہم تندیِ صہبا سے بھی پگھلا نہیں کرتے

(۳)

پھر رہِ عشق وہی زادِ سفر مانگے ہے
وقت پھر قلبِ تپاں دیدۂ ترمانگے ہے
سجدے مقبول نہیں بارگہِ نازیں اب
آستاں حسن کا، سجدے نہیں سرمانگے ہے
کس نے پہنچا دیا اس ہوش ربا وادی میں
کہ جہاں وحشتِ دل زادِ سفر مانگے ہے
میری دنیا کے تقاضوں ہی پہ موقوف نہیں
دین بھی ایک نیا فکر و نظر مانگے ہے
عشق کو زاویۂ دید بدلنا ہوگا
جلوۂ حسن نیا ذوقِ نظر مانگے ہے
سب کی آنکھوں سے بچا کر جو کبھی لوٹے تھے
وقت ہر چور سے وہ لعل و گہر مانگے ہے
دین و دُنیا ہو کہ ہو عشق و ہوس اے ساغرؔ
ہر کوئی خونِ جگر خونِ جگر مانگے ہے

(۴)

صدیوں کی شبِ غم کو سحر ہم نے بنایا
ذرّات کو خورشید و قمر ہم نے بنایا
تخلیق اندھیروں سے کیے ہم نے اُجالے
ہر شب کو اِک ایوانِ سحر ہم نے بنایا
ہر قاب کے سینے میں کیا ہم نے چراغاں
ہر موجۂ دریا کو شرر ہم نے بنایا
شبنم سے نہیں رنگ دیا دل کے لہو سے
ہر خار کو برگِ گلِ تر ہم نے بنایا
ہر خار کے سینے میں چمن ہم نے کھلائے
ہر پھول کو فردوسِ نظر ہم نے بنایا
رفتار کو کھلتے ہوئے غنچوں کی صدا دی
ہر گام کو اِک خلدِ نظر ہم نے بنایا
ہر رخ سے ترے حسن کی ضو پھوٹ رہی ہے
کیا زاویۂ فکر و نظر ہم نے بنایا
اشکوں کو شفق رنگ کیا خونِ جگر سے
کیا غازۂ رخسارِ سحر ہم نے بنایا
ڈھلتے ہیں جہاں بادۂ تجدید کے ساغر
وہ میکدۂ فکر و نظر ہم نے بنایا

۵

پھر یہ ساقی یہ رات ہو کہ نہ ہو
پھر یہ خلدِ حیات ہو کہ نہ ہو
غنچۂ دل مرا کھلے نہ کھلے
پھر شگفتہ حیات ہو کہ نہ ہو
ماہ و انجم نچوڑ اے ساقی
کل سنہری یہ رات ہو کہ نہ ہو
کھیل طوفاں سے آج ہی ناداں
کل اسے بھی ثبات ہو کہ نہ ہو
شق ہے احساسِ قُرب سے سینہ
یہ تلاطم کی رات ہو کہ نہ ہو
حُسن کو دادِ رقص دے بڑھ کر
وجد میں کل حیات ہو کہ نہ ہو
آج ہی عرضِ دل تمام کریں
پھر کبھی ان سے بات ہو کہ نہ ہو
اس سے اک آخری غزل سن لیں
پھر جوانی سے بات ہو کہ نہ ہو
سن رموزِ حیات ساغرؔ سے
کل یہ والا صفات ہو کہ نہ ہو

سحر: کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

(۱)

نامہ بر آتے رہے جاتے رہے
ہجر میں یوں دل کو بہلاتے رہے
یہ بھی کیا کم ہے کہ میرے حال پر
دیر تک وہ غور فرماتے رہے
شدّتِ احساسِ تنہائی نہ پوچھ
ہم بھری محفل میں گھبراتے رہے
ہجر کی تاریکیاں بڑھتی گئیں
مہر و مہ آتے رہے جاتے رہے
کوئی کیا جانے گا یہ راز و نیاز
دل ہمیں ہم دل کو سمجھاتے رہے
منزلِ مقصود پر پہنچے وہی
راہ میں جو ٹھوکریں کھاتے رہے
نشۂ مے تیز تر ہوتا گیا
شیخ صاحب وعظ فرماتے رہے
کیا عجب شے ہے متاعِ دل سحر
جو اسے کھوتے رہے پاتے رہے

۲

ان شوخ حسینوں کی نرالی ہے ادا بھی
بت ہو کے سمجھتے ہیں کہ جیسے ہیں خدا بھی

گھبرا کے اٹھی ہے مری بالیں سے قضا بھی
جاں بخش ہے کتنی ترے دامن کی ہوا بھی

یوں دیکھ رہے ہیں مری جانب وہ سرِ بزم
جس طرح کسی بات پہ خوش بھی ہیں، خفا بھی

مایوسِ محبت ہے تو کر اور محبّت
کہتے ہیں جسے عشق مرض بھی ہے دوا بھی

تجھ پر ہی سحر ہے کہ تو کس حال میں کاٹے
جینا تو حقیقت میں سزا بھی ہے جزا بھی

(۳)

ہر لحظہ مکیں دل میں تری یاد رہے گی
بستی یہ اجڑنے پہ بھی آباد رہے گی

ہے ہستیِ عاشق کا بس اتنا ہی فسانہ
برباد تھی، برباد ہے، برباد رہے گی

ہے عشق وہ نعمت جو خریدی نہیں جاتی
یہ شے ہے خداداد، خداداد رہے گی

صیّاد کو معلوم نہ تھا راز یہ شاید
یہ روح، قفس میں بھی تو آزاد رہے گی

وہ آئے بھی تو ضبط سے لب ہل نہ سکیں گے
فریاد مری، تشنۂ فریاد رہے گی

یہ حسنِ ستم کوش، ستم کوش ہے کب تک
کب تک یہ نظر بانیٔ بیداد رہے گی

وہ زلفِ پریشاں کا سنوارے نہ سنورنا
وہ اُن کے بگڑنے کی ادا یاد رہے گی

(۴)

حسن کو مطلقاً نہیں ہے ثبات
عشق آیا ہے پی کر آبِ حیات

ہجر میں یوں گزرتے ہیں لمحات
اک نفس موت ہے تو ایک حیات

عشق ہے مشغلِ نظر ورنہ!
زندگی کیا ہے اک اندھیری رات

عقل کی استقامتیں تسلیم!
لغزشِ بے خودی بھی ہے اک بات

موت ہے زندگی سے بیزاری
زندگی کیا ہے آرزوئے حیات

خلد پرور ہے ہر نگاہ سحرؔ
یہ خطِ جام ہے کہ راہِ نجات

(۵)

گھٹا ہے باغ ہے، مے ہے، سبو ہے جام ہے ساقی
اب اس کے بعد جو کچھ ہے وہ تیرا کام ہے ساقی
امیدِ وصل رکھنا اک خیالِ خام ہے ساقی
برا تو کچھ نہیں، لیکن مذاقِ عام ہے ساقی
فلک دشمن، مخالف گردشِ ایّام ہے ساقی
مگر ہم ہیں، تری محفل ہے، دورِ جام ہے ساقی
جو اپنی ہر نظر سے اک خدا تخلیق کرتے ہیں
انھیں دیر و حرم سی چیز سے کیا کام ہے ساقی
اُداسی، سرد آہیں، کرب، حسرت، درد، مجبوری
محبّت تلخیوں کا ایک شیریں نام ہے ساقی
جنھیں شوقِ طلب ہے اور جنھیں ذوقِ تجسّس ہے
انھیں کوہ و بیاباں منزلِ یک گام ہے ساقی

سروش: رفعت سروش

(۱)

ہر قدم گردِ حوادث میں چھپایا ہے مجھے
گردشِ وقت نے افسانہ بنایا ہے مجھے
میں کہ اک نورِ معانی تھا، نہ صورت، نہ صدا
تم نے چہروں کی نقابوں میں چھپایا ہے مجھے
میں تو اک سوکھا ہوا پھول ہوں، پامالِ خزاں
تم نے کیا سوچ کے آنکھوں سے لگایا ہے مجھے
میرے معبود! مجھے پھول بنایا تو نے
کیوں مگر سینۂ صحرا پہ کھلایا ہے مجھے
ٹوٹتے رہتے ہیں خنجر سے مرے سینے میں
یادِ ماضی نے یہ کیا روگ لگایا ہے مجھے

(۲)

گھر کو اب دشتِ کربلا لکھوں
آج خود اپنا مرثیا لکھوں
سادہ کاغذ پہ خون کے آنسو
اب اسے خط میں اور کیا لکھوں
برگِ گل پر، صبا کے دامن پر
نام تیرا ہی جا بجا لکھوں
ذکر آئے جو تیری منزل کا
چاند سورج کو نقشِ پا لکھوں
ہو ترا ہی جمال پیشِ نظر
جب قلم سے خدا خدا لکھوں
میں تو زندہ ہوں، مر چکا ہے وہ
اپنے قاتل کا مرثیا لکھوں
اے سروش اپنی زندگی کو میں
کون سے جرم کی سزا لکھوں

(۳)

ہم سفر پہ نکلے تھے، لوٹ کر جو گھر آئے
جنگلوں کے سناٹے اپنے منتظر پائے
سارے پھول مرجھائے، سارے خواب کملائے
اب بہار کا نغمہ کس طرح لکھا جائے
اس کی موت سے پہلے شاخ شاخ تھے غنچے
ہم بہار کا موسم آج دفن کر آئے
زلزلے سے ہیں دل میں، آندھیاں ہیں سینے میں
ہائے کیسے عالم میں میرے غم گسار آئے
رات میرے خوابوں میں کتنی بجلیاں کوندیں
رات میرے آنگن میں کتنے چاند گہنائے
پھر بدل گیا موسم، سبز ہیں شجر، لیکن،
اڑ گئے تھے جو طائر لوٹ کر نہیں آئے
غم کی دھوپ جب پھیلی زندگی کے صحرا میں
اے سروش یاد آئے اس کی زلف کے سائے

(۴)

شہرِ شور و شر تنہا ، گھر کے بام و در تنہا
تم نہیں تو لگتا ہے عام بشر تنہا
درد آشنا طائر چھیڑ نغمۂ حسرت
کیوں خموش بیٹھا ہے غم کی شاخ پر تنہا
جب خوشی کا موسم تھا ہر سفر تھا اک عالم
کاٹنی ہے اب لیکن غم کی رہ گزر تنہا
ہر طرف تری یادیں مسکراتی رہتی ہیں
کس نے کہہ دیا تجھ سے اب ہے میرا گھر تنہا
تم نے بعد مدت کے دل کا حال پوچھا ہے
کروٹیں بدلتا ہے غم کی سیج پر تنہا
شہر کے گلی کوچے پوچھتے ہیں رہ رہ کر
اے سروش پھرتے ہو کیوں اِدھر اُدھر تنہا

(۵)

لذتِ درد کا حسرت و یاس کا
میرا دل اب جزیرہ ہے احساس کا
جسم سیراب و شاداب گلشن مگر
روح صحرائے بے رنگ ہے پیاس کا
جانے ہم کس ستارے کی مخلوق ہیں
زندگی ایک عرصہ ہے بن باس کا
اتنا خالی نہیں درد کا آسماں
ایک پنچھی اڑا جائے ہے آس کا
زندگی اک نیا گھر بنانے چلی
چونچ میں ایک تنکا لیے گھاس کا

سلام مچھلی شہری

۱

جی کر رہے ہو مفت میں ہلکان چپ رہو
اس شہرِ گل کے لوگ ہیں انجان چپ رہو

جتنا بھی چھیڑتے ہو بہاروں کی داستاں
اتنا ہی ہو رہا ہوں پریشان چپ رہو

منظر حضورِ نغمۂ سازِ بہار ہے
پس منظرِ بہار ہے سنسان چپ رہو

سگرٹ کی طرح حضرتِ غالب کے شہر میں
بکنے لگے ہیں میرؔ کے دیوان چپ رہو

اک خامشیٔ صبر بھی فریاد ہو! کہ اب
بکنے لگے ہیں نقرئی ایوان چپ رہو

بڑھنے لگا ہے زہرۂ گیتی کا بانکپن
چھونے لگا ہے چاند کو انسان چپ رہو

دنیا کو آج فرصتِ نغمہ نہیں سلامؔ
بے کار ہو رہے ہو پریشان چپ رہو

(۲)

اسے بھی اپنے مسائل میں مبتلا نہ کرو
اداس ہو تو کسی دوست سے ملا نہ کرو

کلی کھلے گی ستارے ضرور چمکیں گے
یہ اور بات کہ تم شکر یہ ادا نہ کرو

بجھے تو اتنے پریشان اتنے افسردہ
چراغ بن کے کہا تھا کبھی جلا نہ کرو

گنہ کی راہ میں اک روشنی کا موڑ بھی ہے
مرے لیے ابھی اے ناصحو دعا نہ کرو

نئے رفیقو میرے حال پر ترس کھا کر
ابھی سے ترکِ تعلق کی ابتدا نہ کرو

جو حسن کار ہو ساری فضا تمھاری ہے
اگر نہیں ہو تو پھر شکوۂ فضا نہ کرو

تمھارے خواب کے پیکر مجھی سے ملتے ہیں
جو مجھ سے چڑ ہے تو آئینہ میں سجا نہ کرو

مجھے تو قلزمِ ہستی نے یہ بتایا ہے
سفر ہے شرط تو پھر فکرِ ناخدا نہ کرو

یہ کم نہیں ہے کہ اس دور میں بھی زندہ ہو
سلام صورتِ حالات کا گلا نہ کرو

(۲)

شگفتہ بچوں کا چہرا دکھائی دینے لگے
میں کیا کروں کہ اجالا دکھائی دینے لگے
یہ سخت ظلم ہے مالک کہ صبح ہوتے ہی
تمام گھر میں اندھیرا دکھائی دینے لگے
وہ صرف میں ہوں جو سو جنتیں سجا کر بھی
اداس اداس سا تنہا دکھائی دینے لگے
میں کامیاب جبھی ہوں گا اے رباب حیات
کہ بزم کو ترا نغما دکھائی دینے لگے
گلاب اگانے کی عادت سے فائدہ کیا ہے
اگر گلاب میں شعلا دکھائی دینے لگے
مرا ہی عکس سہی پھر بھی وہ فرشتہ ہے
جو غیر ہو کے بھی اپنا دکھائی دینے لگے
بہت علیل ہو لیکن یہ بزدلی ہے سلام
کہ تم کو موت کا سایا دکھائی دینے لگے

(۴)

آنسوؤں میں کوئی غنچہ نہ کھلا میرے بعد
زندگی کس نے ترا درد سہا میرے بعد
مطربِ عارض و گیسو نہ رہا میرے بعد
حسن کے شہر کی سونی ہے فضا میرے بعد
کون اب حسن کی تزئیں کا الم سمجھے گا
دل کہ آئینہ تھا وہ ٹوٹ گیا میرے بعد
لاکھ انگڑائی لو اب چاند کو چھونے کے لیے
خود تو کھلنے سے رہے بندِ قبا میرے بعد
یوں تو کھلتے بھی ہیں ہنستے بھی ہیں گلزار میں پھول
کوئی طوفانِ بہاراں نہ رہا میرے بعد
چھوڑ کر خلد کو آدم نے فرشتوں سے کہا
خود فسردہ سا نہ ہو جائے خدا میرے بعد
اے سلام آج کے باعزم جوانوں کے لیے
جلوہ زا ہیں مرے نقشِ کفِ پا میرے بعد

۵

وہ چشمِ ناز مری سمت یوں اٹھی ہے کہ ہائے
اک ایسی چوٹ دلِ زار پر لگی ہے کہ ہائے
کبھی ہنسا تھا رُخِ گل پہ دیکھ کر شبنم
ابھی تلک مری پلکوں پہ وہ نمی ہے کہ ہائے
تمام شہر بظاہر حسین ہے لیکن
تمام شہر میں کچھ ایسی بے بسی ہے کہ ہائے
میں چھیڑتا تو ہوں ہر بار اک نیا نغمہ
صدائے ساز کچھ ایسی دبی دبی ہے کہ ہائے
وہ اور ہوں گے جنھیں میکدہ مبارک ہے
میرے لیے تو وہ انجامِ میکشی ہے کہ ہائے
یہی کہا تھا کہ تم شہرِ دل کی ملکہ ہو
بس اتنی بات پہ کچھ ایسی برہمی ہے کہ ہائے
تمام شہر میں ہے شورِ انقلاب سلام
تمام چہروں پہ ایسی فسردگی ہے کہ ہائے

سلطان نظامی

(۱)

آئینوں میں عکس بن کر جن کے پیکر آ گئے
حلقۂ تنہائی سے وہ لوگ باہر آ گئے

سائباں نے تپتے سورج سے ملائی کیا نظر
ان گنت سورج مرے گھر کے اندر آ گئے

قینچیوں کو پھر نئے سر سے ملیں گے مشغلے
پھر اڑانوں کے لیے بازو میں شہ پر آ گئے

وحشتوں کی داد کو محتاج ہی رہتے مگر
اس حویلی سے گزرنا تھا کہ پتھّر آ گئے

مشعلِ راہِ محبت ہیں مرے نقشِ قدم
جن پہ چل کر منزلوں تک آج رہبر آ گئے

عشق کی پابندیاں بیکار ہو کر رہ گئیں
ہم تصور میں کسی کے ہونٹ چھو کر آ گئے

آئنے الفاظ کے سلطان کرتے ہیں کمال
بل جبینوں پر پڑے ہاتھوں میں خنجر آ گئے

(۲)

جو کشمکش بھی ترا انتظار کرتے
جھجک رہا ہوں اسے آشکار کرتے
کسیلی دھوپ کی شدت کو بھی نظر میں
کسی درخت کو بے برگ و بار کرتے
گذشتہ سال کی آفات کب خیال میں
نشیمنوں کو سپردِ بہار کرتے
کسی نے اپنے گریباں میں کیا تلاش
ہمارے رقصِ وفا کا شمار کرتے ہ
ہوا کے پاؤں بھی شل ہو کے رہ گ
ترے نگر کی فصیلوں کو پار کرتے ہ
یہی ہوا کہ سمندر کو پی کے بیٹھ
ہماری ناؤ سفر اختیار کرتے ہ
اسی کے واسطے سلطان بے قرار ہ
جسے قرار ملے بے قرار کرتے ہ

(۳)

باہر حصارِ غم سے فقط دیکھنے میں تھا
الجھا ہوا تو وہ بھی کسی مسئلے میں تھا
یوں بھی غلط امید کا الزام آ گیا
حالاں کہ ہر سوال مرا ضابطے میں تھا
دنیا کی فکر تجھ کو مجھے تھا ترا خیال
بس اتنا فرق تیرے مرے سوچنے میں تھا
ہر شخص اپنے آپ کو سمجھے ہوئے تھا میر
تقلید کار کوئی کہاں قافلے میں تھا
پتھر وہیں سے آتے تھے مجھ کو نوازنے
شیشے کا اک مکاں جو مرے راستے میں تھا
سلطان حکمراں تھا وہ ہر لمحہ ذہن پر
مشغول رات دن میں جسے بھولنے میں تھا

سید غلام سمنانی

(۱)

یہ تو کچھ بھی نہیں داماں و گریباں کش
دیکھ لوگے ابھی کہتے ہیں کسے جاں کش
رسمِ پابندیِ آئینِ وفا ہے ہم
آپ سے سیکھے کوئی جرأتِ پیماں ش
بن گئی مژدۂ بیداریِ اربابِ ج
وہ مری دیدۂ بے خواب کی مژگا
اب کہاں زہد، کہاں حرمتِ تقویٰ
غمزۂ دوست کی اللہ رے ایماں
آج پابندیِ زنجیر و سلاسل ہے
کل سمجھ جاؤ گے کیا ہوتی ہے زند
تلخی و تیرگیِ زیست میں یاد آتی
ان کے لب ہائے شکر ریز کی مرجا
لعل و گوہر شکنی کوئی بڑی چیز
ہے بڑا جرم عزیزو دلِ ا

(۲)

ہیں کب سے بکھرے ہوئے گیسوئے دوتا
نہ دے سکی کوئی پیغام بھی صبا
نہ ہے وہ خارِ تمنائے آرزو، جس
تمام عمر ہی رکھا برہنہ پا
رہی ہے وہ نگہ ناز ملتفت
ملی نہ لذتِ بیداریِ وفا
مژہ کشا تو مری سمت وہ ہوئے
زفرق تا بہ قدم کردیا فنا
ہمیشہ قلب و جگر کو مرے نوازا
تلاش کیوں نہ کرے ناوکِ بلا مجھ
ہزار رنج و مصیبت ہزار درد و
یہی ملا ہے وفا کا مری صلا
کنشت و دیر و حرم بھی ملے تھے
کہیں تو ملتا کوئی رمز آشنا مجھ

(۳)

وہ تمکنت وہ آپ کا پندار کیا ہوا
یعنی فسونِ نرگسِ بیمار کیا ہوا
ہر شہر دیکھ آئے ہیں ہم آپ ہی کہیں
جس جا بکے ہے بخت وہ بازار کیا ہوا
جو غم کی تیز دھوپ میں بخشے ہمیں سکوں
اے ہم نفس وہ سایۂ دیوار کیا ہوا
یوں تو ہر ایک ذرہ چمن زارِ حسن ہے
جس جا ملے وہ گل وہ چمن زار کیا ہوا
کیا ہو گئیں وہ آنکھوں کی انجم فشانیاں
یعنی چراغِ بزمِ شبِ تار کیا ہوا
دیر و حرم کا جس سے تقدس تھا برقرار
وہ ارتباطِ سبحہ و زنّار کیا ہوا
اب تم بھی بھول جاتے ہو اپنی کہی ہوئی
تم نے کیا تھا رات جو اقرار کیا ہوا

(۴)

ہے یہ وہ دور کہ طوفاں کو بھی ساحل کہیئے
آ پڑے گر کوئی مشکل تو نہ مشکل کہیئے
اس قدر فتنے بپا کیوں ہیں مرے قتل کے لیے
بات یوں ہے کسی قاتل کو نہ قاتل کہیئے
دیجیئے ہجر کے آزار کو بھی وصل کا نام
شورِ فریاد کو گلبانگِ عنادل کہیئے
حق کا اعلان ہی کافی نہیں اے شیخ زماں
حق کو حق کہیے تو باطل کو بھی باطل کہیئے
شاخ ٹوٹے تو اسے کہیے شکستِ امید
کوئی بھی شمع بجھے اس کو مرادل کہیئے
گر فغاں سنیے اسے کہیے جرس سے منسوب
گر غبار اٹھے اسے پردۂ محمل کہیئے
زخمیٔ ناوکِ مژگاں کو نہ کہیے زخمی
کشتۂ تیغِ تغافل کو نہ بسمل کہیئے
بات کہنے نہیں آتی تو نہ کہیئے صاحب
کیا ضروری ہے کہ صحرا کو بھی محفل کہیئے
کہیئے ہر ذرۂ بے مایہ کو رشکِ خورشید
بد گہر ہو تو اسے جوہرِ قابل کہیئے

سیفی پریمی

(۱)

آغازِ محبت کا افسانہ مچلتا
محفل میں کوئی آنچل رہ رہ کے سنبھلتا
خواہش سے کہیں کوئی ماحول بدلتا
دل شمع کا جلتا ہے تب موم پگھلتا
معلوم کِسے ناصح اُس شوخ ک
اپنا دلِ ناداں بھی سو رنگ بد
دیکھیں تو چراغوں کو اب کون بچ
طاقوں میں لہو اپنا ہر رات کو
سوچا ہے کہ کچھ دن کو بیگانہ ہی
ہم اپنا جسے سمجھیں بیگانہ نکلتا
اب سخت ضرورت ہے میخانہ
ہر لب کے لیے ساقی پیمانہ یا
جس راہ سے وہ گزریں ہر گام
اک جسم نہیں چلتا، ماحول بھی
اے دوست ترے در تک پھیلی ہیں
دل ایک مسافر ہے گرتا ہے سنبھ
ہم ہجر میں جب جاگے تھی رات
دیدار کا ہر موسم لمحات میں ڈ

(۲)

اک موجِ تبسّم نے ہر بات بھلادی
زخموں کی جزا دی ہے، چاہت کی سزا دی
رنگینیٔ صہبا میں اک آگ لگا دی
واعظ کے بیانوں کو رندوں نے دعا دی
تم اپنے پسندیدہ ساتھی کی امانت
دیوار سے ہم نے بھی تصویر ہٹا دی
ان ہجر کی راتوں میں کوئی کہیں تنک
بیتے ہوئے لمحوں نے زنجیر ہلا دی۔
یہ درد کے افسانے گمراہ فرشتے
گمراہ فرشتوں نے زخموں کو ہوا دی
پھر ایک گلِ تیر کے ہمراہ چلے ہیں
پھر گردشِ دوراں نے جینے کی جزا دی
پیراہنِ رنگیں میں اندامِ غزالاں
جن پچھ کی زمیں سیفی کشمیر کی وادی

(۳)

دلبری میرے لیے دوستی اغیار کے
اُس کا اک روپ ہے ہر ایک طلب گار کے
ربطِ دل یوں ہی نہیں عشوۂ دل دار کے،
اُس میں کچھ اور بھی ہے، خوبیٔ گفتار کے،
زاہدو! ذکرِ عبادت کو عبادت
آؤ اک رات گزارو کسی بیمار کے
گردشِ وقت کی پہچان کسے تھی،
عمر بہتی گئی اک شوخِ طرح دار کے
قصرِ جاناں کی طرف بند ہیں اپنی ر
اُنسیت ہے وہی لیکن در و دیوار کے
غیر کو مسندِ زرکار مبارک ....
اک تجلی ہے فروزاں مرے افکار کے
ایک بازار نہیں، حشر ہے "جن پتھ" ر
درد بکتا ہے یہاں، دیدۂ بیدار کے،

(۴)

رنگ برسا کہیں رنگین قبا سے پہلے
درد چمکا کہیں جلووں کی عطا سے پہلے
ایک ٹھہرے ہوئے دریا کی طرح تھی یکسر
زندگانی کسی آنچل کی ہوا سے پہلے
تاجداروں کے اشاروں پہ رہا رزقِ جہاں
اے خدا! خضرِ معیشت کی صدا سے پہلے
دل کے خوابوں کو بھی درکار ہے کوئی دستک
سویا ہوتا ہے چمن بادِ صبا سے پہلے
ایک تقصیرِ حسیں پر ہے بنائے عالم
حسنِ گیتی تھا کہاں میری خطا سے پہلے
اٹھتے جاتے ہیں قدم خود ہی سحر کی جانب
کوئی گزرا ہے اِسی شہرِ وفا سے پہلے
ہم نے دنیا کو نیا رُوپ دیا ہے سیفی
خون ارزاں تھا یہاں رنگِ حنا سے پہلے

(۵)

موسمِ رنگ و بو، دورِ شہرِ طرب، دل اکیلا تھا غم کا سہارا لیے
زندگی جھوم اٹھی، فاصلے مِٹ گئے، ناگہاں اُس نے جشنِ بہاراں کیے
کیا فسوں ہے کہ جب تجھ سے ملتا ہوں میں گو زمانہ ہوا ہے محبّت کیے
چند یادیں لپکتی ہیں دل کی طرف، جیسے مندر کے طاقوں میں جلتے دیے
آج پوری خدائی میں تنہا ہوں میں، ہر نفس کو ہے دلدار کی جستجو
اے نگارِ حَسیں پھر وہ لمحے مِلا، جن میں مخمور رہتے تھے ہم بے پیے
گردشِ چرخ سے دل ہراساں نہیں، زندگی بے کسی سے شناسا نہیں
میں نہایت ہوں ممنونِ حُسنِ کرم، تم نے اچھا کیا مجھ کو غم دے دیے
قدرِ راحت ہمارے مقدر میں تھی، آج حُسنِ بہاراں کے مختار ہیں
اپنے دشمن کو اتنا کہاں حوصلہ، ہم غموں میں پلے، ہم خزاں میں جیے
تب کہیں پا سکی ہیں تبسّم کی ضو، اُس گلابی بدن، سحر انداز سے
کس کو معلوم آنکھوں کی غم ناکیاں، کتنے تارے گِنے، کتنے آنسو پیے
عہدِ ترکِ محبّت ہوا ہے اُدھر، ہم بھی اس اجنبی حُسن کو دیکھ لیں
یاد پڑتا ہے کچھ کچھ کہ پہلے کبھی، اپنے دل نے بھی ایسے ارادے کیے
اُس دیارِ حَسیں سے گزرتے ہیں دل، کس قدر شوق میں، کتنے آداب سے
جس جگہ ہے تری انکھڑیوں کا چمن، تیرے رخسار و لب اپنی خوشبو لیے
ہو مبارک تمھیں راحتِ روز و شب، اب نہ ابھرے گی ماتھے پہ کوئی شکن
سیفیِ مضطرت رازِ غم پا گیا، کوئی کہہ دے کہ اُس نے بھی لب سی لیے

شادؔ : نریش کمار شاد

۱

ایک دھوکا ہے یہ شب رنگ سویرا کیا ہے
یہ اجالا ہے اجالا تو اندھیرا کیا ہے
تو مرے غم میں نہ ہنستی ہوئی آنکھوں کو رُلا
میں تو مر مر کے بھی جی سکتا ہوں میرا کیا ہے
ذرّے ذرّے میں دھڑکتی ہے کوئی شے جیسے
تری نظروں نے فضاؤں میں بکھیرا کیا ہے
دردِ دنیا کی تڑپ دل میں مرے رہنے دے
تُو تو آنکھوں میں بھی رہ سکتی ہے تیرا کیا ہے
تنگ ہے شادؔ مرے ذوق کی وسعت کے لیے
حلقۂ زلف ہے آفاق کا گھیرا کیا ہے

(۲)

ڈوب کر پار اتر گئے ہیں ہم
لوگ سمجھے کہ مر گئے ہیں ہم
اے غمِ دہر! تیرا کیا ہوگا
یہ اگر سچ ہے مر گئے ہیں ہم
خیر مقدم کیا حوادث نے
زندگی میں جدھر گئے ہیں ہم
یا بگڑ کر اُجڑ گئے ہیں لوگ
یا بگڑ کر سنور گئے ہیں ہم
موت کو مُنہ دکھائیں کیا یارب!
زندگی ہی میں مر گئے ہیں ہم
ہائے کیا شے ہے نشۂ مے بھی
فرش سے عرش پر گئے ہیں ہم
آرزوؤں کی آگ میں جل کر
اور بھی کچھ نکھر گئے ہیں ہم
جب بھی ہم کو کیا گیا محبوس
مثلِ نکہت بکھر گئے ہیں ہم
شادمانی کے رنگ محلوں میں
شاد با چشمِ تر گئے ہیں ہم

(۳)

پھر اس دنیا سے اُمیدِ وفا ہے
تجھے اے زندگی کیا ہو گیا ہے
بڑی ظالم نہایت بے وفا ہے
یہ دنیا پھر بھی کتنی خوشنما ہے
کوئی دیکھے تو بزمِ زندگی میں
اُجالوں نے اندھیرا کر دیا ہے
خدا سے لوگ بھی خائف کبھی تھے
مگر لوگوں سے اب خائف خدا ہے
مزے پوچھو کچھ اس سے زندگی کے
حوادث میں جسے جینا پڑا ہے
مرے پہلو میں دل ہے تو یقیناً
ازل ہی سے مگر ٹوٹا ہوا ہے
زبان و فن سے میں واقف نہیں ہوں
مگر وجدان میرا رہنما ہے
مرے نقاد میری شاعری تو
مرے ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہے
کہاں ہوں شاؔد میں تو شاد سا ہوں
وہ شادِ خوش نوا تو مر چکا ہے

(۴)

بدگماں مجھ سے نہ اے فصلِ بہاراں ہوتا
میری عادت ہے خزاں میں بھی گل افشاں ہوتا
میرے غم کو بھی دلآویز بنا دیتا ہے
تیری آنکھوں سے میرے غم کا نمایاں ہوتا
کیوں نہ پیار آئے اُسے اپنی پریشانی پر
سیکھ لے جو تری زلفوں سے پریشاں ہوتا
میرے وجدان نے محسوس کیا ہے اکثر
تیری خاموش نگاہوں کا غزل خواں ہوتا
یہ تو ممکن ہے کسی روز خدا بن جائے
غیر ممکن ہے مگر شیخ کا انساں ہوتا
اپنی وحشت کی نمائش مجھے منظور نہ تھی
ورنہ دشوار نہ تھا چاک گریباں ہوتا
رہبرِ شوق کو گمراہ بھی کر دیتا ہے
بعض اوقات کسی راہ کا آساں ہوتا
کیوں گریزاں ہو مری جان پریشانی سے
دوسرا نام ہے جینے کا پریشاں ہوتا
جن کو ہمدرد سمجھتے ہو ہنسیں گے تم پر
حالِ دل کہہ کے نہ اے شادؔ پشیماں ہوتا

(۵)

کون سلگتے آنسو روکے، آگ کے ٹکڑے کون چبائے
اے ہم کو سمجھانے والے کوئی تجھے کیوں کر سمجھائے
جیون کے اندھیارے پتھ پر جس نے تیرا ساتھ دیا تھا
دیکھ کہیں وہ کومل آشا آنسو بن کر ٹوٹ نہ جائے
اس دنیا کے رہنے والے اپنا اپنا غم کھاتے ہیں
کون پرایا روگ خریدے کون پرایا دکھ اپنائے
ہائے مری مایوس امیدیں وائے مرے ناکام ارادے
مرنے کی تدبیر نہ سوجھی جینے کے انداز نہ آئے
اس دنیا کے غم خانے میں غم سے اتنی فرصت کب ہے
کون ستاروں کا منھ چومے کون بہاروں میں لہرائے
ضبط بھی کب تک ہو سکتا ہے صبر کی بھی اک حد ہوتی ہے
پل بھر چین نہ پانے والا کب تک اپنا روگ چھپائے
شاؔد وہی آوارہ شاعر جس نے تجھ سے پیار کیا تھا
شہروں شہروں گھوم رہا ہے ارمانوں کی لاش اٹھائے

شاہد ماہلی

۱

ہر در و دیوار پہ لرزاں کوئی پیکر لگے
کتنی شکلوں کا پری خانہ ہمارا گھر لگے

دوڑتی جائیں رگوں میں نیلگوں خاموشیاں
دور تک پھیلا ہوا یوں دھند کا منظر لگے

بند کمرے میں بلائے جاں ہے احساسِ سکوت
اور باہر ہر طرف آواز کا پتھر لگے

جیسے جیسے ٹوٹتا جائے نگاہوں کا بھرم
شخصیت اپنی بھی اپنے آپ کو کمتر لگے

کانپ جاتا ہے صدائے دل سے صحرائے سکوت
اور اپنے پاؤں کی آہٹ سے بھی اب ڈر لگے

ایک بے معنی تجسس ایک بے معنی تلاش
ایک شعلہ سا لپکتا جسم میں اکثر لگے

(۲)

ہر مرحلے سے یوں تو گزر جائے گی یہ شام
لے کر بلائے درد کدھر جائے گی یہ شام
پھیلیں گی چار سمت سنہری اداسیاں
ٹکرا کے کوہِ شب سے بکھر جائے گی یہ شام
رگ رگ میں پھیل جائے گا تنہائیوں کا زہر
چپکے سے میرے دل میں اُتر جائے گی یہ شام
ٹوٹا یقین، زخمی امیدیں، سیاہ خواب
کیا لے کے آج سوئے سحر جائے گی یہ شام
ٹھہرے گی ایک لمحے کو یہ گردشِ حیات
تھم جائے گی یہ صبح، ٹھہر جائے گی یہ شام
خونیں بہت ہیں مملکتِ شب کی سرحدیں
ہاتھوں میں لے کے کاسۂ سر جائے گی یہ شام
مہکے گا لفظ لفظ سے شاہدِ دیارِ صبح
لے کر مری غزل کا اثر جائے گی یہ شام

(۳)

بجھے بجھے سے چراغوں سے سلسلہ پایا
ہجومِ یاس میں بھٹکے تو راستہ پایا

کسی خیال میں ابھرا اُمید کا چہرہ
کسی اُمید میں پرتو، خیال کا پایا

نہ جانے کتنے گھروندوں کو ٹوٹتے دیکھا
کسی کھنڈر میں تمنّا کا نقشِ پا، پایا

تمام رات نیا بُت تراشتے گزری
ہوئی جو صبح تو اس بُت کو ٹوٹتا پایا

قدم قدم پہ ملے یوں تو قہقہے بکھرے
درونِ جسم کوئی شخص چیختا پایا

طلسم ٹوٹ گیا، دھند چھٹ گئی شاہد
کہیں پہ ٹھہر کے سوچیں کہ ہم نے کیا پایا

شمیم حنفی

۱

کیوں پریشان ہوا جاتا ہے دل کیا جانے
کیسا پاگل ہے کہ پانی کو بھی صحرا جانے

میں وہ آوارہ کہ بادل بھی خفا ہیں مجھ سے
تو زمانے کو بھی ٹھہرا ہوا لمحا جانے

دھوپ کی گرد فضاؤں میں دلوں میں تابوت
ہر نفس خود کو بس اک آہ کا شعلا جانے

اوس کی بوند بھی اب سنگ صفت لگتی ہے
پھول کے باغ کو دل آگ کا دریا جانے

رات پتھر میں ڈھلی چاند بھی کالا نکلا
ایسے منظر کو بھی اب آنکھ تماشا جانے

بے صدا گنبدِ احساس، ہوا مہر بہ لب
پھول کے درد کا قصہ کوئی کانٹا جانے

دن کی خندق کا دھواں شہر سے آگے بھی گیا
کس طرح گھر کا پتہ کوئی پرندا جانے

۲

ایک بے نام و نشاں روح کا پیکر ہوں میں
اپنی آنکھوں سے الجھتا ہوا منظر ہوں میں
کون بہتے ہوئے پانی کو صدا دیتا ہے
کون دریا سے یہ کہتا ہے سمندر ہوں میں
مجھ کو دم بھر کی رفاقت بھی ہوا کو نہ ملی
اپنی پرچھائیں سے لپٹا ہوا پتھر ہوں میں
یہی اجڑی ہوئی بستی ہے ٹھکانا میرا
ڈھونڈنے والے اسی خاک کے اندر ہوں میں
قہر بن جائیں گی یہ خون کی پیاسی راہیں
زندگی مجھ میں سمٹ آ کہ ترا گھر ہوں میں

(۳)

بند کر کے کھڑکیاں یوں رات کو باہر نہ دیکھ
ڈوبتی آنکھوں سے اپنے شہر کا منظر نہ دیکھ

میں نے پتھر سہہ لیے لیکن صدا قائل ہوئی
خود کو لفظوں سے بچا گرتے ہوئے پتھر نہ دیکھ

ایسا ہنگامہ کہ آوازِ نفس بھی کھو گئی
زندگی کی بات کر یہ عرصۂ محشر نہ دیکھ

تو نے جو پرچھائیاں چھوڑیں وہ صحرا بن گئیں
اے نگارِ وقت اب پیچھے کبھی مڑ کر نہ دیکھ

کیا پتا زنجیر میں ڈھل جائے چادر کی شکن
یہ سفر کا وقت ہے اب جانبِ بستر نہ دیکھ

خاک و خوں میراث تیری خاک و خوں تیرا نصیب
اس زیاں خانے میں اپنے پاؤں کا چکر نہ دیکھ

۴

سمجھ سکے نہ جسے کوئی بھی سوال ایسا
بُنا ہے سانس کے دھاگوں نے ایک جال ایسا
کبھی دماغ تھا مجھ کو بھی خودپرستی کا
پلٹ کے ذہن میں آیا نہ پھر خیال ایسا
میں آسماں تو نہ تھا جس میں چاند چھپ جاتے
ہوا نہ ہوگا کسی کا کبھی زوال ایسا
تمام عمر نئے لفظ کی تلاش رہی
کتابِ درد کا مضموں تھا پائمال ایسا
کنارِ آب نہ پہنچے گی جان کی کشتی
بہت دنوں سے ہے پانی میں اشتعال ایسا

شمیم عثمانی

۱

مجھ سے دنیا آشنا اور خود سے میں نا آشنا
دُور باش اے خوش فریبی کون کس کا آشنا

عہدِ ظلمت میں دلوں کے حال سے واقف تھے ہم
روشنی کے دور میں ہیں صرف چہرا آشنا

کچھ نہیں اس کے سوا صحرا گزینی کا سبب
ظرف اپنا قطرہ ساماں پیاس دریا آشنا

کون ہے میرے سوا آئینہ بردارِ سحر
میں چراغِ آخرِ شب کا ہوں تنہا آشنا

کچھ نہ کچھ تو تیرگی پر آنچ آتی دوستو
کاش ہوتے یہ خس و خاشاک شعلا آشنا

ایک دن آجائے گی میری زباں پر دل کی بات
ایک دن ہو جائے گا ہر آشنا نا آشنا

صرف تم سے ہی نہیں خود سے بھی میں بیزار ہوں
میری مشکل یہ ہے یارو میں ہوں اپنا آشنا

چاک داماں ہیں سبھی بازارِ شہرِ حسن میں
کس کا دامن ہے مگر دستِ زلیخا آشنا

کتنے دربانوں کا درماں بے نیازی تھی شمیم
بن گیا آزارِ جاں دردِ مسیحا آشنا

۲

ہے شکست آمادہ ایوانِ سیہ آثارِ شب
چڑھتے سورج کا پجاری بن گیا معمارِ شب

یہ تماشا کب تلک اے محرمِ اسرارِ شب
صبحدم ہے کشتنی ہر زنارہ و بیدارِ شب

تھا چراغِ شعلہ رو سے روشنی کا کچھ بھرم
آفتابِ زرد رو سے بڑھ گیا پندارِ شب

اے تنک گوشو یہ تم نے کاٹ دی کس کی زباں
تھا نقیبِ صبحِ معنی، صاحبِ گفتارِ شب

کون ہے جو اپنی وحشت سے نہیں آشفتہ جاں
تیرگی ہے آج خود ہی درپئے آزارِ شب

اے تہی کیسہ کہیں سے نقدِ خوابِ آشوب لا
سرد پڑتی جا رہی ہے گرمیِ بازارِ شب

چشمِ تر کوتاہ بیں تھی ورنہ یہ بھی دیکھتی
تھا پسِ دیوارِ گریہ خندۂ ہشیارِ شب

کھو گیا آخر کہاں تو اے حریفِ دوست کام
جی جلاتا ہے بہت ہم مشربِ اغیارِ شب

اپنی اس بےچارگی کا ذکر کیا کیجیے شمیم
قاتلِ احساس نکلا مونس و غمخوارِ شب

(۳)

کیا بتاؤں کون دامن گیرِ قاتل ہے یہاں
خونِ ناحق تشنۂ شمشیرِ قاتل ہے یہاں
جانتے ہیں خوب یہ حلقہ بگوشانِ وفا
ہر قدم پر حلقۂ زنجیرِ قاتل ہے یہاں
آئینے جھوٹے ہیں یا آنکھیں منافق ہوگئیں
پیکرِ معصومیت تصویرِ قاتل ہے یہاں
کون دیکھے خواب کس کو سر نہیں اپنا عزیز
خواب بھی شرمندۂ تعبیرِ قاتل ہے یہاں
بے نیازِ سرد و گرم و کامیابِ رزم و بزم
خندہ زن تقدیر پر تدبیرِ قاتل ہے یہاں
نوکِ خنجر نے لکھی ہیں سب کی تقدیریں مگر
خود نوشتہ صرف اک تقدیرِ قاتل ہے یہاں
خلوتیں برباد لیکن محفلیں آباد ہیں
باعثِ تخریبِ دل، تعمیرِ قاتل ہے یہاں
کوچۂ قاتل میں وضعِ بندگی ہے کافری
اصلِ ایماں جرأتِ تکفیرِ قاتل ہے یہاں
یہ قلم و منصفِ خنجر بکف کی ہے شمیم
معتبر کچھ ہے تو وہ تحریرِ قاتل ہے یہاں

(۴)

میں شعلہ نفس سوختہ جاں مجھ کو نہ چھیڑو
جل جائیں گے یہ کون و مکاں مجھ کو نہ چھیڑو
تم ریگِ رواں ہو کے بھی پا بوسِ ہوا ہو
میں سر بہ فلک کوہِ گراں مجھ کو نہ چھیڑو
مقتل کو عدالت نہ کہا ہے نہ کہوں گا
فریاد رساں دادگراں مجھ کو نہ چھیڑو
میں نعرۂ مصلوب ہوں تاریخ انا کا
اے تاجورِ خوش سخناں مجھ کو نہ چھیڑو
تم شیشہ بدن آذر فرہاد کے وارث
میں شیشہ شکن سنگِ گراں مجھ کو نہ چھیڑو
میں منتظرِ نوکِ سناں غنچۂ دل گیر
ممنونِ صبا گل بدناں مجھ کو نہ چھیڑو
میں آتشِ رفتہ کا ہوں خاکسترِ حساس
اٹھتا ہے مرے دل سے دھواں مجھ کو نہ چھیڑو
الفاظ تو خوش رنگ نقابوں کی طرح ہیں
پڑھتا ہوں میں چہروں کی زباں مجھ کو نہ چھیڑو
کیا میر کا دیوان شمیم آئے ہو پڑھ کر
ہر شخص سے کہتے ہو میاں مجھ کو نہ چھیڑو

شمیم کرہانی

(۱)

زباں کو حکم ہی کہاں کہ داستانِ غم کہیں
ادا، ادا سے تم کہو نظر نظر سے ہم کہیں
جو تم خدا خدا کہو تو ہم صنم صنم کہیں
کہ ایک ہی سی بات ہے وہ تم کہو کہ ہم کہیں
نہ داستانِ بتکدہ، نہ قصۂ حرم کہیں
کچھ آدمی کا غم سُنیں، کچھ آدمی کا غم کہیں
ستم گرانِ سادہ دل یہ بات جانتے نہیں
کہ وہ ستم ظریف ہیں، ستم کو جو کرم کہیں
تمھارا پاسِ عشق ہے کہ چپ ہیں بولتے نہیں
وگرنہ حق کی بات کو تو دار پر بھی ہم کہیں
سبو ہو میرے ہاتھ میں تو کاسۂ گداگری
جو تم اٹھا لو جام کو تو لوگ جامِ جم کہیں
شمیمؔ وہ نہ ساتھ دیں تو مجھ سے طے نہ ہو سکیں
یہ زندگی کے راستے کہ زلفِ خم بہ خم کہیں

(۲)

وہ دل بھی جلاتے ہیں رکھ دیتے ہیں مر
کیا طرفہ طبیعت ہے، شعلہ بھی ہیں شبنہ
خاموش نہ تھا دل بھی، خوابیدہ نہ تھے ہ
تنہا تو نہیں گزرا، تنہائی کا عا
چھلکا ہے کہیں شیشہ ڈھلکا ہے کہیں
گلشن کی ہواؤں میں، نغمہ بھی ہے
ہر دل کو لبھاتا ہے، غم تیری محبت
تیری ہی طرح ظالم، دلکش ہے ترا
انکارِ محبت کو، توہین سمجھے
اظہارِ محبت پر ہو جاتے ہیں بر
تم رک کے نہیں ملتے، ہم جھک کے نہ
معلوم یہ ہوتا ہے کچھ تم بھی ہو کچھ ہ
پائی نہ شمیم اپنے ساقی کی نظ
ہر آن بدلتا ہے میخانے کا مو

(۳)

ملتے ہیں کہاں خود کو ہم بے خودِ
ہم سے بھی ملا دینا، مل جائیں جو
روداد غمِ دوراں کرتا ہوں
مقتل سے گزرتا ہے میرا ہی ق
اُس آگ کا اک شعلہ دنیا کے
اک عمر سے جلتے ہیں جس آگ میں
نذرِ غم دنیا ہے اب ذوقِ پرس
ویراں ہیں صنم خانے، پھرتے ہیں
اے گردشِ دوراں تو اُس وقت کی
جب ہم نے زمانے میں رکھا تھا ق
احساس اَنا کیا ہے؟ احساسِ وج
ہم کو نہ چھڑا ہم سے، رہ جائیں
ساقی ہے نہ صہبا ہے کیا دو
میخانے میں بیٹھے ہیں، با دیدہ

(۴)

جشنِ حیات ہو چکا، جشنِ ممات اور ہے
ایک برات آچکی، ایک برات اور ہے
عشق کی اک زبان پر لاکھ طرح کی بندشیں
آپ تو جو کہیں بجا، آپ کی بات اور ہے
پینے کو اس جہان میں کون سی مے نہیں مگر
عشق جو بانٹتا ہے وہ، آبِ حیات اور ہے
ظلمتِ وقت سے کہو، حسرتِ دل نکال لے
ظلمتِ وقت کے لیے آج کی رات اور ہے
ان کو شمیمؔ کس طرح نامۂ آرزو لکھیں
لکھنے کی بات اور ہے، کہنے کی بات اور ہے

(۵)

فاصلہ تو ہے مگر کوئی فاصلا نہیں
مجھ سے تم جدا سہی دل سے تم جدا نہیں

کاروانِ آرزو اس طرف نہ رخ کرے
اُن کی رہ گزر ہے دل، عام راستا نہیں

آئیے چراغِ دل آج ہی جلائیں ہم
کیسی کل ہوا چلے کوئی جانتا نہیں

اک شکستِ آئنہ بن گئی ہے سانحہ
ٹوٹ جائے دل اگر کوئی حادثا نہیں

دل ہی اک خموش تھا شورشِ حیات میں
ہم نے کچھ کہا مگر آپ نے سنا نہیں

لیجیے بلا لیا آپ کو خیال میں
اب تو دیکھیے سہی، کوئی دیکھتا نہیں

کس لیے شمیمؔ سے اتنی بدگمانیاں
مل کے دیکھیے کبھی، آدمی بُرا نہیں

شہاب جعفری

(۱)

ضربِ تیشہ کی صدا میں کیا اٹھاکر لے گئے
ٹوٹتے پتھر سے ہم صحرا اٹھاکر لے گئے

بےخودی کو جانتے کیا ہم خودی خوانِ جنوں
قطرے کی تمہید میں دریا اٹھاکر لے گئے

پانو جب سمٹے تو رستے بھی ہوئے تکیہ نشیں
بوریا جب تہہ کیا دنیا اٹھاکر لے گئے

ہر جگہ جاں کو یہی دھڑکا کہ لٹ جائیں نہ ہم
ہم تو ہر دھرتی سے گھر اپنا اٹھاکر لے گئے

اس سفر میں ساتھ کون آتا، صدا تو سب کو دی
زندگی کا بوجھ تھا، تنہا اٹھاکر لے گئے

ہیں پر اتنے بھی نہیں شائستۂ تشنہ لبی
ہم سے گر شبنم چھنی، دریا اٹھاکر لے گئے

سربلند اپنا لہو تھا، سرنگوں قاتل کی تیغ
ہم ہتیلی پر جو سر اپنا اٹھاکر لے گئے

ہم تری آواز کے رسیا' یہ درگاہِ جنوں
شعلۂ حرف و صدا لپکا، اٹھاکر لے گئے

دشت در دشت اک صدائے بازگشت اپنی شہاب
سارے پتھر اپنا سناٹا اٹھاکر لے گئے

(۲)

قیدِ امکاں سے تمنا تھی غمیں، چھوٹ گئی
پاؤں ہم نے جب اٹھایا تو زمیں چھوٹ گئی

لیے جاتا ہے خلاؤں میں جمالِ شب و روز
دن کہیں چھوٹ گیا، رات کہیں چھوٹ گئی

میرے سورج، میرے ہمدم، مری منزل تو بتا
تیرے آفاق تک آیا ہوں، زمیں چھوٹ گئی

اب کہاں کا ہوں مسافر مجھے معلوم نہیں
ہاں بس اتنا، تری چوکھٹ سے جبیں چھوٹ گئی

کیا غریب الوطنی سی ہے، غریب الوطنی
آسماں ساتھ چلا، گھر کی زمیں چھوٹ گئی

الجھے الجھے سے جو ہم پھرتے ہیں اب شہر بہ شہر
دلنوازی سی کوئی شے تھی، کہیں چھوٹ گئی

زندگی کیا تھی، میں اک موج کے پیچھے تھا رواں
اور وہ موج کہ ساحل کے قریں چھوٹ گئی

گھر جو لوٹے بھی سرِ شام تو کچھ پاس نہ تھا
دن سے پرچھائیں ملی تھی، سو کہیں چھوٹ گئی

بود و باش اپنی نہ پوچھو کہ اسی شہر میں ہم
سادگی گاؤں کی لائے تھے، یہیں چھوٹ گئی

(۳)

سب حال سے سرگراں ملیں گے
ماضی کے کتاب خواں ملیں گے
تنکوں کی بھی شخصیت کا سمّان
شہرِ دود کے پاسباں ملیں گے
مذہب کے حصار میں تو جھانکو
تہذیب کے نوحہ خواں ملیں گے
پلٹو بھی تو سرورق زمیں کا
قبروں کے تلے مکاں ملیں گے
قبروں پہ مکاں، مکاں پہ قبریں
یہ سلسلے جاوداں ملیں گے
حُسن کلمۂ المعاش، معبود
معبد تجھے بے اماں ملیں گے
لے دیکھ مری اڑان کی رو
دُھنکے ہوئے آسماں ملیں گے
اچھا تو پھر الوداع - جاؤ!
ہاں سچ تو ہے پھر کہاں ملیں گے
کیوں شعلوں سے اوس پوچھتی ہو
ہم دونوں دھواں ملیں گے

(۴)

گُلِ نو کے ہاتھ سے دم بہ دم جو صبا نکلتی چلی گئی
تو چمن چمن تھی وہ تشنگی کہ بہار جلتی چلی گئی
میں مسافرِ رہِ درد تھا ہر امید دستِ سوال تھی
یہ حیات موجِ سراب تھی مرے ساتھ چلتی چلی گئی
تری یادِ گلشنِ خواب تھی کہ مری نواؤں کے دشت میں
یہ بہار شمعِ خیال تھی سرِ شاخ جلتی چلی گئی
تری آرزو تو نہ تھی مگر تو کہاں ہے میرے نگارِ حسن
تیری جستجو کے بغیر بھی رہِ دل بدلتی چلی گئی
ترے گیسوؤں کی کہانیاں جو سنیں تو نیند سی آ چلی
سفرِ حیات میں سخت تھی مری رات ڈھلتی چلی گئی
نظر آئی منزلِ آرزو، تو ہر اک نشیب و فراز پر
یہ قدم بہکتے چلے گئے وہ نظر سنبھلتی چلی گئی

۵

(بہ یادِ یاسمیں)

تاؤ تنکوں کی لو کاٹی، سی بلے رات گئے
موجِ شہرود ترا گھاٹ چلے رات گئے

روز و شب کا ترے بعد ایک سُر ایسا اترا
رات ہوتی ہے مگر دن نہ ڈھلے رات گئے

ایک اُڑتی ہوئی آواز، نوا کا لہرا
پنکھ پھیلائے ترا روپ چھلے رات گئے

سیڑھیاں چڑھتی مرے گھر کی، کہیں ان حد میں
کوئی دستک سی مرے دل کو کھلے رات گئے

کمرے کمرے میں رچیت رات کو دمکاتی ہوئی
سلیلی سانولی پرچھائیں چلے رات گئے

یاسمیں تن کی چھبن میری نظر پر ترے بیچ
اور پہلو میں مرا نام نہ لے رات گئے

تیرے زانو پہ مرا سر، مرے سر پر ترا ہاتھ
رات کے ساتھ وہی رات چلے رات گئے

شعلۂ خواب ہو یا درد کا ایندھن، چپ چاپ
تجھ میں جو راکھ تلے، مجھ میں جلے رات گئے

لمسِ آغوش میں آ، لمسِ تصور سے نہ چھل
اُف، گھپا سا، ترے آنچل کے تلے رات گئے

صادق

(۱)

بچھڑا ہر اک فرد بھرے خاندان کا
مجھ کو شراپ لگ گیا کس بے زبان کا

قدموں تلے تھے جتنے سمندر سرک گئے
اب کیا کروں گا دیکھ کے مُنھ بادبان کا

میرے وجود کے کوئی معنی نہیں رہے
تیکھا سا ایک تیر ہوں ٹوٹی کمان کا

آکاش کو سنے سے کوئی فائدہ نہیں
بہتر ہے نقص دیکھ لوں اپنی اُڑان کا

جب سے ہوا ہے راج پشاچوں کا شہر پہ
جنگل میں ہم کو خوف نہیں اپنی جان کا

میں نے اٹھائے ہاتھ دعا کے لیے مگر
لاشہ زمیں پہ آن پڑا آسمان کا

۲

پھر سے لہولہو درو دیوار دیکھ لے
جو بھی دکھائے وقت وہ ناچار دیکھ لے
اپنے گلے پہ چلتی چھُری کا بھی دھیان رکھ
وہ تیز ہے یا کُند ذرا دھار دیکھ لے
پھر چھوٹنے سے پہلے ہی اپنے وجُود کو
موجود بچپنوں میں گرفتار دیکھ لے
گھُستا چلا ہے پیٹ میں ہر آدمی کا سر
تجھ سے بھی ہو سکے گا نہ انکار دیکھ لے
یوں روز روز کرتے اداکاریاں، تری
صورت بدل گئی ہے مرے یار دیکھ لے

(۳)

ارض و سما، آلا تنگ کے تیری پکار پر
پھر آ کھڑا ہوا ہوں سفر کی کگار پر
وعدے پہ تیرے گرد کی تہہ ہے جمی ہوئی
جالے تنے ہوئے ہیں مرے انتظار پر
ہے وسعتوں پہ آنکھ تو پانوں رکاب میں
پر میرا بس نہیں ہے ترے اختیار پر
وہ سوگوار جھوٹی تسلّی پہ خوش ہوا
بھرپور غم نے وار کیا غم گسار پر
اپنی بلندیوں کے عَلَم کو ذرا سنبھال
پتھر ہوس کے پھینک نہ بچّے انار پر

(۴)

سُن لے جو کبھی خاک کا آہنگ لہو میں
دستار روایت کا نہ ہو تنگ لہو میں
تقسیم لہو کی نہیں آسان نظر رکھ
ایسا نہ ہو چھڑ جائے کہیں جنگ لہو میں
تجھ کو بھی پکارے گا لہو بیچ عدالت
پھنس جائے گا پھینکے گا اگر سنگ لہو میں
اک دن تجھے یاد اپنے بھی معنی نہ رہیں گے
ڈھونڈے نہ کہیں پائے گا فرہنگ لہو میں

صوفی : صغیر احمد صوفی

(۱)

میرے احساس کو آئینا دکھاتا کیوں ہے
تو سمندر ہے تو قطرے کو ڈراتا کیوں ہے
تو حقیقت ہے تو اپنے کو نمایاں کر دے
تو اگر خواب ہے پھر خواب دکھاتا کیوں ہے
تیرا ایمان ہی جب ترکِ تعلق ٹھہرا
اک بجھتی ہوئی قندیل جلاتا کیوں ہے
تیری تقدیر میں طوفان بھی ہیں، آنسو بھی
پھر بھلا ریت کی دیوار اٹھاتا کیوں ہے
موسمِ گل کا فسانہ تو سنانے دے انھیں
خشک پتّوں کو درختوں سے گراتا کیوں ہے
تو عجب خواب ہے جس کی کوئی تدبیر نہیں
میری تنہائی کی رگ رگ میں سماتا کیوں ہے
مٹ گیا جب ترا احساسِ جمال اے صوفی
ذہن میں پھر نئی تصویر بناتا کیوں ہے

(۲)

خلوصِ عشق کا ایثار جب سوا ہوگا
غرورِ حُسن بھی شرمندۂ وفا ہوگا

تیرے خیال کی رعنائیاں بھی کیا کم ہیں
مگر وہ وقت کہ جب ترا سامنا ہوگا

کوئی تو آئے گا لے کر پیامِ موسمِ گل
کبھی تو نخلِ تمنّا مرا ہرا ہوگا

تیرے دیار سے لوٹے ہوئے تو دیر ہوئی
تری گلی میں مرا سایہ گھومتا ہوگا

اکیلا دیکھ کے تجھ کو وہ راستا گھر کا
کبھی تو کچھ میرے بارے میں پوچھتا ہوگا

ہجومِ یاس سے گھبرا نہ اس قدر صوفی
کہ رفتہ رفتہ یہ دل درد آشنا ہوگا

۳

ہے دعوتِ تجدیدِ وفا دیکھیے کیا ہو
ہر زخم ہُوا دل کا ہرا، دیکھیے کیا ہو

اُس زلف کی مہکار لیے دشتِ جنوں میں
پھرتی ہے کئی دن سے صبا، دیکھیے کیا ہو

غیروں کے ستم اور پھر اپنے سے بغاوت
اس دور میں جینے کی سزا، دیکھیے کیا ہو

ہاتھوں میں گداؤں کے بھی کشکولِ ہوس ہے
اب اس کے سوا روزِ جزا، دیکھیے کیا ہو

سورج کا جلا، خنکیِ مہتاب کا گھائل
آیا ہے کوئی آبلہ پا، دیکھیے کیا ہو

ہے جسم پہ احساس کے پیراہنِ شعلہ
ہر سانس میں جلتی ہے چتا، دیکھیے کیا ہو

کچھ روز سے وہ پُرسشِ احوال کرے ہے
صوفی کو محبت میں عطا، دیکھیے کیا ہو

۴

جس شخص کے دامن پہ مرا خون لگا ہے
ہر شخص عقیدت سے اسے دیکھ رہا ہے

کہتے ہو تو چلتا ہوں ابھی جانبِ مقتل
لیکن یہ مرا جسم تو پتھر کا بنا ہے

بادل کی طرح آج برس جائیں گے ہم تم
ہم دونوں کے ہونٹوں پہ شکایت کی گھٹا ہے

آنے کی اجازت نہیں دیتا وہ کسی کو
تنہائی کا اک بھوت مرے گھر میں بسا ہے

مانندِ نسیمِ سحری آ گئے ہم بھی
راتوں میں ترے جسم کا جب پھول کھلا ہے

ہاں ایک خدا ہو تو عبادت بھی ہے ممکن
اس دور میں ہر بندۂ ناچیز خدا ہے

صوفی کبھی ہاتھوں کو نہ کشکول بناؤ
ملتا ہے وہی جو کہ مقدر میں لکھا ہے

(۵)

ہم کو سب اپنے قتل کی شرطیں قبول ہیں
مقتل میں کیوں خداؤں کے چہرے ملول ہیں
گویا زمینِ شور ہے ہر خطۂ چمن
بوتے ہیں ہم گلاب تو اگتے ببول ہیں
آجاؤ احتیاط کی دیوار توڑ کر
چاہت میں ذات پات کے جھگڑے فضول ہیں
پھیلی ہوئی ہے اپنی تہی دامنی کی بات
اب کے برس بہار میں کانٹے نہ پھول ہیں
چلتے رہیں گے ساتھ ترے، اے صبا خرام
ہم سنگِ رہ نہیں ترے قدموں کی دھول ہیں
اب جورِ ناروا کا کسی سے گلا نہیں
صوفی کی زندگی کے نرالے اصول ہیں

ضیاؔ فتح آبادی

(۱)

تماشا ہے سب کچھ، مگر کچھ نہیں
سوائے فریبِ نظر کچھ نہیں
زمانہ یہ ہے رقصِ ذرّات کا
حکایاتِ شمس و قمر کچھ نہیں
ستاروں سے آگے مری منزلیں
بلا سے اگر بال و پر کچھ نہیں
محبت کی یہ محویت کیا کہوں
وہ آئے تو اپنی خبر کچھ نہیں
مرا شوقِ منزل ہے ثابت قدم
کوئی رہزن و راہبر کچھ نہیں
محبت ہے انسان کی آبرو
بغیرِ محبت بشر کچھ نہیں
ضیاؔ تو مریضِ غمِ عشق ہے
علاج اس کا اے چارہ گر کچھ نہیں

۲

حُسن ہے محبت ہے موسمِ بہاراں ہے
کائنات رقصاں ہے، زندگی غزل خواں ہے
گیت ہیں جوانی ہے ابر ہے بہاریں ہیں
مضطرب اِدھر میں ہوں تو اُدھر پریشاں ہے
ردِ عملِ ساقی پر کس قدر تھے کل برہم
میکدہ ہے آج اپنا اور تنگ داماں ہے
اُف دورنگیٔ دنیا، اُف تضاد کا عالم
کفر کے اجالے ہیں تیرگیٔ ایماں ہے
بے نقاب دیکھا تھا خواب میں انھیں اک شب
آج تک نگاہوں میں اے ضیاؔ چراغاں ہے

طالب دہلوی

(۱)

جب گُل کے ساتھ خار کا دل ٹوٹ جائے گا
آشفتۂ بہار کا دل ٹوٹ جائے گا
بے مہریاں اگر تری حد سے گزر گئیں
ایک ایک غمگسار کا دل ٹوٹ جائے گا
کیا جُڑ سکے گا پھر کسی آئینہ ساز سے
جب اک وفا شعار کا دل ٹوٹ جائے گا
اتنا نہ انتظار کی گھڑیوں کو طول دے
اک محوِ انتظار کا دل ٹوٹ جائے گا
تیری خوشی یہی ہے تو اچّھا یہی سہی
تیرے امیدوار کا دل ٹوٹ جائے گا
ٹھکرا نہ اس طرح دلِ الفت شعار کو
شیشے کی طرح پیار کا دل ٹوٹ جائے گا
اُٹھی اگر نہ اس پہ تری چشمِ التفات
طالب سے بے قرار کا دل ٹوٹ جائے گا

(۲)

کسی سے قصۂ ہجر و وصال کہتے ہیں
گزر رہا ہے جو دل پر وہ حال کہتے ہیں
یہ کون ہے، جسے آئینہ منھ دکھا نہ سکا
یہ کس کو اہلِ نظر بے مثال کہتے ہیں
نگاہ جس کے نظارے کی تاب لا نہ سکے
اسی کو حُسن اسی کو جمال کہتے ہیں
تمام روحِ عمل ہے تمام جانِ عمل
وہ دل کی موج جسے سب خیال کہتے ہیں
بجز ترے نظر آتا نہیں کوئی تجھ کو
یہ وہ مقام ہے جس کو وصال کہتے ہیں
غبار بن کے اٹھا بھی تو کیا اٹھا کوئی
یہی عروج ہے اس کو کمال کہتے ہیں
وہ کیفیات ہیں وارفتگی کی اے طالب
صنم پرست جنھیں حال و قال کہتے ہیں

(۳)

ہر شے میں عکسِ جلوۂ جانانہ ایک ہے
آنکھیں کھلیں، تو کعبہ و بت خانہ ایک ہے
رہتا ہے گرم و سرد سے دوراں کے بے نیاز
اپنی روش کا سبزۂ بے گانہ ایک ہے
یہ امتیازِ ما و شما ہے بہ یک نفس
زیرِ زمیں یگانہ و بیگانہ ایک ہے
نیرنگِ روزگار کا شاکی نہیں ہے کون
کیفیتیں ہزار ہوں افسانہ ایک ہے
آئینہ ساں جو زنگِ دوئی سے ہے پاک وصاف
اس کے لیے یگانہ و بیگانہ ایک ہے
احساسِ زندگی ہے ترے دم سے دہر میں
سچ ہے فسونِ ہمّتِ مردانہ ایک ہے
دفتر ہے فلسفہ کا ہر ایک شعرِ تر ترا
طالب! یہ تیری طرزِ جداگانہ ایک ہے

(۴)

محبّت! ماورائے کفر دیں ہے
محبّت کا کوئی مذہب نہیں ہے
محبّت! حُسن ہے حُسن آفریں ہے
محبّت حُسن سے بڑھ کر حسیں ہے
بظاہر خاک کا پتلا ہے سب کچھ
جو دیکھو غور سے کچھ بھی نہیں ہے
محبّت جس کو کہتا ہے زمانہ
یہی وہ زہر ہے جو انگبیں ہے
مکافاتِ عمل ہے بزمِ ہستی
یہیں دوزخ یہیں خلدِ بریں ہے
حقیقت حُسن کی کچھ ہے تو اتنی
جو چڑھ جائے نظر میں وہ حسیں ہے
محبّت کا نہیں ہے کوئی خالق
محبّت خود محبّت آفریں ہے
کہا جاتا ہے یہ طالبؔ سے اکثر
سخن ترا نہایت دل نشیں ہے

(۵)

شکوہ کی بات ہے نہ شکایت کی بات ہے
آپس کی گفتگو ہے محبّت کی بات ہے

ایثار چاہتی ہے محبّت بنامِ ترک
اب امتحانِ ظرف ہے ہمّت کی بات ہے

بت خانے میں بھی نورِ خدا دیکھتا ہوں میں
جی ہاں، یہ میرے حُسنِ عقیدت کی بات ہے

کیوں دوسروں کی زیست سے لیتا نہیں سبق
جو بات آدمی کی ہے حیرت کی بات ہے

جو تجھ کو ناپسند ہے اوروں کو ہے پسند
یہ اپنے اپنے ذوق و طبیعت کی بات ہے

میں بے ادب نہیں ہوں رہیں آپ مطمئن
خلوت ہی میں کہوں گا جو خلوت کی بات ہے

اغیار کو بھی اتنا تو آخر ہے اعتراف
طالبؔ کی بات بات، صداقت کی بات ہے

طالبؔ چکوالی

(۱)

غموں کے کھیت میں پیدا کبھی خوشی نہ ہوئی
ستم ظریفیٔ فطرت سے دل لگی نہ ہوئی

ہزار ضبط کیا، لب سیے، پیے آنسو
غمِ حیات میں لیکن کوئی کمی نہ ہوئی

دل و دماغ کو تسکین تیری باتوں سے
کبھی کبھی تو ہوئی، اور کبھی کبھی نہ ہوئی

ہے اپنی اپنی طبیعت، ہے اپنا اپنا ظرف
وہ دوست بن نہ سکے ہم سے دشمنی نہ ہوئی

کسی بھی رخ سے نہ پایا حیات کو دلکش
یہ زندگی تو کسی طور زندگی نہ ہوئی

خیال مرنے کا آیا تو بارہا لیکن
خدا کے حکم سے توفیقِ خودکشی نہ ہوئی

ہے کیا کلام کہ طالبؔ رہے بہت اچھے
بروں میں رہ کے بھی نیّت کبھی بری نہ ہوئی

(۲)

بے کیف مسرت بھی مصیبت سی لگے ہے
اے دوست مجھے غم کی ضرورت سی لگے ہے
روداد محبت کی کسی کو نہ سناؤ
کچھ لوگ ہیں جن کو یہ شکایت سی لگے ہے
دم توڑتی قدروں کو بچانے کی اچھل کود
فطرت کے اصولوں سے بغاوت سی لگے ہے
دنیائے تماشہ تو بدلتی ہے کئی رنگ
گہہ خواب لگے گاہ حقیقت سی لگے ہے
احساس کا دھوکا ہے کہ جذبات کا جادو
اپنوں کی عداوت بھی محبت سی لگے ہے
بے ربط خیالوں کے شگوفوں کی لطافت
مجبور غریبوں کی ذہانت سی لگے ہے
طالب کو شرافت پہ بڑا ناز تھا لیکن
اب اس کی شرافت بھی حماقت سی لگے ہے

ظفر مرادآبادی

۱

موجِ ہر لمحہ سراپا غم گزیدہ اور میں
اجنبی لاشوں پہ اک یہ آبدیدہ اور میں

پہلے ملنے کی خوشی اور پھر بچھڑ جانے کا غم
بے ثبات آنکھوں میں وہ خوابِ پریدہ اور میں

مدتوں کے فاصلے ، لیکن شناسائی بہت
عکسِ آئینہ ہے ، شخصِ برگزیدہ اور میں

کیوں نہ اُلجھیں ، معنی و مفہوم میں تنہائیاں
وہ کتابِ دل کش و خطِ کشیدہ اور میں

سیکڑوں خنجر ہیں میری سمت ہی بڑھتے ہوئے
آندھیوں میں اک چراغِ نو دمیدہ اور میں

صبح دم ، ہر وہم غائب ، حیرتیں پیشِ نظر
شب سراپا دیدۂ وحشت گزیدہ اور میں

جرأتِ تدبیر ان حالات میں کیا ہو ظفر
ایک ہی گھر میں ہے قاتل آرمیدہ اور میں

(۲)

بے مروّت کم نظر، اف یہ برہنا آئینہ
میری نظروں میں مجھے کرتا ہے رسوا آئینہ

کتنے پچھتاووں کے سائے روبرو لہرا اٹھے
جب ہُوا بازیچۂ اسرارِ دنیا آئینہ

آئینے سے سیکھ لو، چہرے بدلتے کا ہنر
جیسا چہرہ ہے مقابل، خود ہے ویسا آئینہ

کب ہوس کی ظلمتوں میں بچ سکیں گے خدّ و خال
ہوگیا جب گردشِ شب گرتے ہی میلا آئینہ

تہمتیں جتنی ہیں میری ذات سے منسوب ہیں
پتھّروں کے درمیاں ہوں میں ہی تنہا آئینہ

ہنستیں دونوں جدا لیکن مزاجاً ایک ہیں
میری بے باکی کہ ہو کوئی چمکتا آئینہ

اے ظفرؔ اک عمر کے ساتھی ہیں سارے اجنبی
اس بھری بستی میں ہے میرا شناسا آئینہ

(۳)

یک بہ یک گلچیں کی نظروں سے اُتر جانے کا خوف
پھول کو شاخِ تمنّا پر بکھر جانے کا خوف
کس طرح بے چہرگی سے کر ہم آئیں سامنے
ہو اگر پہلے ہی آئینوں سے ڈر جانے کا خوف
مونا لیزا ہیں خود ہی آنکھیں میں تے، نابینا نہیں
آنکھ کھلنے سے ہے خوابوں کے بکھر جانے کا خوف
ہیں مری ہی جاں کے دشمن، صاحبانِ اقتدار
مجھ سے ہے اس عہد کو بیدار کر جانے کا خوف
میرے احساسات، مری فکر، مجھ سے چھین لو
مجھ کو ہے خود اپنے اندر ہی بکھر جانے کا خوف
صبح سے یہ ٹھوکریں، رسوائیاں، فکرِ معاش
پھر تہی دستی مری اور شام گھر جانے کا خوف
ہو گئے ہوتے کبھی کے اے ظفرؔ گردِ سفر
روکے ہے اُن کو تنہا چھوڑ کر جانے کا خوف

(۴)

خوش ادا، شوخ لبوں، گل بدنوں کے رشتے
ہم سے منسوب رہے اِن چمنوں کے رشتے

ڈوبتے جاتے ہیں ڈھلتے ہوئے سورج کی طرح
زندگی تجھ سے، ترے بانکپنوں کے رشتے

اس بھرے شہر میں آئینہ تھا میں ہی شاید
مجھ سے وابستہ رہے سنگ زنوں کے رشتے

گفتگو حسنِ تعلّق کی ضمانت تو نہیں
مجھ کو مربوط لگے کم سخنوں کے رشتے

بڑھ گیا اور بھی احساسِ غمِ تنہائی
تھے سرابوں کی طرح انجمنوں کے رشتے

نفرتیں بانٹ گیا، کون محبّت کی جگہ
کس نے یوں توڑ دیے ہم وطنوں کے رشتے

لالہ زاروں کی طرح خون میں ڈوبے ہیں ظفر
کس سے منسوب کروں، اِن کفنوں کے رشتے

عامرؔ : یعقوب عامر

(۱)

شخصیت کا زوال ہو جیسے
زندگی عرضِ حال ہو جیسے
سانس لینا کھلی فضاؤں میں
آرزوئے وصال ہو جیسے
کتنی تشویش ہے مسیحا کو
آبرو کا سوال ہو جیسے
شب کو رخصت کیا ہے اشکوں سے
دن گزرنا محال ہو جیسے
یوں گزاری ہے زندگی ہم نے
مجرموں کا سا حال ہو جیسے
ڈھونڈتا ہوں جواز ہستی کا
ہر قدم پر سوال ہو جیسے
زندگی وہ ملی ہمیں عامرؔ
کوئی حرفِ ملال ہو جیسے

(۲)

کبھی تو ساتھ دو رسوائیوں میں
مجھے چھوڑا ہے کیوں تنہائیوں میں
سمندر کے گہر بھی اہلِ زر کے
بہا لے گیا ہے اُن گہرائیوں میں
ہزاروں چاند سورج ہیں زمیں پر
اندھیرا کیوں مگر انگنائیوں میں
یہاں ہر شے ہے عکسِ بے حقیقت
ملے گا کیا تمہیں پرچھائیوں میں
وہی ہم ہیں، وہی موسم، وہی گھر
مگر رونق نہیں انگنائیوں میں
یہی کیا کم ہے وہ ظاہر ہے جتنا
دھرا کیا ہے قیاس آرائیوں میں
کبھی وہ بھی تھا اک رنگِ طبیعت
کہ عالم تھا ترے شیدائیوں میں

(۳)

پھر ہے کوئی حسرتِ تعمیر کیا
کھینچنی ہے درد کی تصویر کیا

چاہیے سیدھا تعلّق یار سے
سلسلہ در سلسلہ تدبیر کیا

اس تماشے کا تماشائی تو ہو
ورنہ یہ جھنکار کیا، زنجیر کیا

کوئی فردِ جرم عائد ہم پہ کر
جرم سے پہلے کوئی تعزیر کیا

غم بہت ہیں دل بہلنے کے لیے
کام آئے گی تری تصویر کیا

وہ تو یہ کہیے کہ نسبت تم سے تھی
ورنہ عامر کی یہاں توقیر کیا

عتیق اللہ

(۱)

کون گزرا تھا محرابِ جاں سے ابھی خامشی مونہہ بھرتا ہوا
دھند میں کوئی شے جوں دمکتی ہوئی اک بدن سا بدن سے ابھرتا ہوا
صرف کرتی ہوئی جیسے ساعت کوئی، لمحہ کوئی فراموش کرتا ہوا
پھر نہ جانے کہاں ٹوٹ کر جا گرا ایک سایہ سروں سے گزرتا ہوا
ایک عمرِ گریزاں کی مہلت بہت پھیلتا ہی گیا میں افق تا افق
میرے باطن کو چھوتی ہوئی وہ نگہ اور میں پیروں تلے پاؤں دھرتا ہوا
یہ جو اُڑتی ہوئی ساعت خواب ہے کتنی محسوس ہے کتنی نایاب ہے
پھول پلکوں سے چنتی ہوئی روشنی اور میں خوش بوئیں تحریر کرتا ہوا
میرے بس میں تھے سارے زماں و مکاں پلک میں دیکھتا رہ گیا ایں و آں
چل دیا ہے کہ چٹکی میں کوئی زمیں آسماں گرد کرتا ہوا
اپنی موجودگی سے تھا میں بے خبر، دیکھتا کیا ہوں ایسے میں یک دم ادھر
قطع کرتی ہوئی شب کے پہلو میں اک آدمی ٹوٹتا اور بکھرتا ہوا

۲

مکاں مکاں مجھے گرد و غبار ایسا لگے
یقین، گرتے ہوئے شہسوار ایسا لگے

وہ آ بھی جائے تو یکسانیت نہیں ٹلتی
ہر ایک پل مجھے خنجر کی دھار ایسا لگے

تمام جسم اک آرے سے کٹنے لگتا ہے
نشے کا چڑھنا، نشے کے اُتار ایسا لگے

بدن کا قلعہ بھی مسمار ہو کے رہ جائے
وہ آخری ہی سہی، ایک وار ایسا لگے

ہو جیسے یہ بھی کوئی دوسرا جنم میرا
کھلی فضاؤں میں دریا کے پار ایسا لگے

(۳)

مرے بازوؤں پہ اتر ذرا
مرے ساتھ کوئی سفر ذرا
مرا سینہ شق، مری چشم نم
کبھی ہو سکے تو ادھر ذرا
مری ظلمتوں میں مقام کر
مرے آنسوؤں میں ٹھہر ذرا
مرے باغ لو سے جھلس گئے
کوئی برگ، کوئی ثمر ذرا
یہی کاندھے میری زمین ہیں
وہ پہاڑ مجھ پہ تو دھر ذرا
وہ کہ ہم تھے جاں سے گزر گئے
کبھی آزما یہ ہنر ذرا
میں کھڑا ہوں جائے نماز پر
مرے سامنے سے گزر ذرا

۴

پھول ہو یا انگارا بھیج
کچھ تو اے دلدارا بھیج
ڈوبنے والا ہے یہ جہاز
اڑتا ہوا طیارا بھیج
صورت صاف نظر آتی ہے
کچھ پانی کچھ گارا بھیج
وہ غم کاندھے توڑ گیا ہے
یہ غم کم ہے سارا بھیج
چاہے جو آفات اُتار
ایک مگر گلتارا بھیج
سبز ابھی ہیں یہ بازو
نامہ کوئی اے یارا بھیج
کب سے ہے یہ جاں دو نیم
جان سے کوئی پیارا بھیج
اڑنے لگی زخموں سے آب
تیر وہی دوبارا بھیج
بھیجنے والے ہاتھ نہ کھینچ
دوبارا سہ بارا بھیج

عرؔش ملسیانی: پنڈت بال مکند

(۱)

خانۂ دل میں داغ جل نہ سکا
اس میں کوئی چراغ جل نہ سکا
نہ ہوئے وہ شریکِ سوزِ نہاں
دل سے دل کا چراغ جل نہ سکا
سوزِ الفت سے عقل ہے محفوظ
جل گیا دل، دماغ جل نہ سکا
برق تھا اضطرابِ دل لیکن
آرزوؤں کا باغ جل نہ سکا
دلِ مایوس میں امید کہاں
بجھ کے پھر یہ چراغ جل نہ سکا
روشنیِ شعور بھی آئی
پھر بھی دل کا چراغ جل نہ سکا
عرؔش! کیا تجھ سے فیضِ محفل کو
تو مثالِ چراغ جل نہ سکا

(۲)

نیرنگیِ بہار و خزاں دیکھتے رہے
حیرت سے ہم طلسمِ جہاں دیکھتے رہے
پیشِ نظر جہاں کے رہی رحمتِ خدا
ہم برہمیِ حسنِ بتاں دیکھتے رہے
ہر گل ہماری عقل پہ ہنستا رہا مگر
ہم فصلِ گل میں رنگِ خزاں دیکھتے رہے
عرضِ نیازِ شوق کی اچھی ملی یہ داد
ہنس کر وہ میرے اشکِ رواں دیکھتے رہے
طے کر گیا جنوں مرا اک جست میں انھیں
حیرت سے مجھ کو کون و مکاں دیکھتے رہے

(۳)

اگر تقدیر تیری باعثِ آزار ہو جائے
تجھے لازم ہے اُس سے برسرِ پیکار ہو جائے

مری کشتی ہے میں ہوں اور گردابِ محبت ہے
جو تو ہو ناخدا میرا تو بیڑا پار ہو جائے

کمالِ ضبطِ غم سے یہ گوارا ہی نہیں مجھ کو
کہ حرفِ آرزو، شرمندۂ اظہار ہو جائے

تیرے خوابِ گراں پر اے دلِ ناداں تعجب ہے
کہ تو سوتا رہے سارا جہاں بیدار ہو جائے

انھیں کیوں کوستا ہے جو تجھے کہتے ہیں کم ہمت
بُرا کیا ہے حقیقت کا اگر اظہار ہو جائے

تمھیں اے عرش کیوں ہے تیرِ غم سے اتنی بیزاری
یہی بہتر ہے یہ ناوک جگر کے پار ہو جائے

(۴)

احساسِ حُسن بن کے نظر میں سما گئے
گو لاکھ دُور تھے وہ، مگر پاس آگئے

اک روشنی سی دل میں تھی وہ بھی نہیں رہی
وہ کیا گئے، چراغ تمنا بجھا گئے

دیر و حرم سے اور تو حاصل نہ کچھ ہوا
سجدے غرورِ عشق کی قیمت گھٹا گئے

تنہا روی میں یوں تو مصیبت تھا ہر قدم
ہم اہلِ کارواں سے تو پیچھا چھڑا گئے

کتنا فریب کار ہے احساسِ بندگی
ہم منزلِ خودی سے بہت دور آگئے

الفت میں فکرِ زیست، ندامت کی بات تھی
اچھے رہے جو جان کی بازی لگا گئے

جو حال ان کا تھا وہ ہمیں جانتے ہیں عرشؔ
یوں وہ ہماری بات ہنسی میں اڑا گئے

(۵)

محبت سوز بھی ہے ساز بھی ہے
خموش بھی ہے یہ آواز بھی ہے
نشیمن کے لیے بیتاب طائر
وہاں پابندیِ پرواز بھی ہے
مری خاموشیِ دل پر نہ جاؤ
کہ اس میں روح کی آواز بھی ہے
خموشی پر بھروسا کرنے والے
خموشی درد کی غمّاز بھی ہے
ہے معراجِ خرد بھی عرش اعظم
جنوں کا فرشِ پا انداز بھی ہے
دل بیگانہ، خود دنیا میں تیرا
کوئی ہمدم، کوئی ہمراز بھی ہے
کبھی محتاج نے کا بھی نہیں یہ
کبھی نغمہ رہینِ ساز بھی ہے
کبھی تو دل ہے محوِ بے نیازی
کبھی طوفِ حریم ناز بھی ہے
ترانہ ہائے سازِ زندگی میں
اک آوازِ شکستِ ساز بھی ہے

عزیز بگھروی

(۱)

بات اپنی کرے یا پرائی کرے
آدمی سوچ کر لب کشائی کرے
حق سے الفت بھی ہے آدمی کو بہت
بات حق کی کہو تو لڑائی کرے
بند آنکھیں نہ کھولے زمانہ اگر
خضر بھی اُس کی کیا رہنمائی کرے
کس قدر اوج پر ہے ستارا ترا
ہر مخالف تری ہمنوائی کرے
مل کے رہنے کا ہم فیصلہ تو کریں
کس میں ہمت ہے ہم میں جدائی کرے
سرفرازی سے محروم اک حکمراں
اک فقیری میں فرمانروائی کرے
ہے جدا سب سے فنکار کا دل عزیزؔ
چوٹ کھائے تو نغمہ سرائی کرے

(۲)

منتظر ہے دستِ قاتل میں کھلا خنجر، چلو
ہم بھی دیکھیں آج اپنے قتل کا منظر، چلو

کچھ تو ٹوٹے اس گھٹن کی زہر ناکی کا طلسم
آندھیو! اب کے برس تم شہر کے اندر چلو

یہ وہ شبنم ہے جو اندر سے جلا دیتی ہے جسم
آگہی کی شعلہ سامانی سے بچ بچ کر چلو

پردہ پوشی سے حقائق تو بدل سکتے نہیں
لو! تمھیں بھی فرض کر لیتے ہیں پیغمبر، چلو

آپ کی گردن پہ کیوں تیغِ ستم پیشہ چلی
ہم تو قاتل کی نظر میں تھے کشیدہ سر چلو

دل میں پیدا ہی نہ ہوگا سیرِ گلشن کا خیال
تم ذرا کچھ دور میرے ساتھ کانٹوں پر چلو

دور تک پھیلا ہو جیسے شب کا سناٹا عزیزؔ
آؤ پھینکیں زندگی کے بحر میں پتھر چلو

(۲)

ناموسِ قلم ، فکرِ گہر بار نہ بیچو
اے دیدہ ورو غیرتِ فنکار نہ بیچو
چپ رہنا تو ہے ظلم کی تائید میں شامل
حق بات کہو ، جراَتِ اظہار نہ بیچو
ورثہ ہے یہ نبیوں کا امانت ہے خدا کی
جاں ہارنے والو ! دلِ خوددار نہ بیچو
کانٹے کبھی ہوتے نہیں پھولوں کے برابر
اے اہلِ چمن حسن کا معیار نہ بیچو
روشن ہے اسی نور سے قندیلِ تمنّا
افسردہ دلو ! لذتِ آزار نہ بیچو
راس آتی نہیں سب کو یہ آوارہ مزاجی
اے دشت نوردو ! ابھی گھر بار نہ بیچو
کہنے دو عزیز اس کو جو کہتا ہے زمانہ
تم اپنا لب و لہجۂ اشعار نہ بیچو

(۴۲)

دیکھا تھا خواب ہم نے دلِ بے قرار کیا
آئی چمن میں لے کے نسیمِ بہار کیا
تیرِ ستم قبول ، ہراک زخمِ دل قبول
آئے تو کوئی سامنے ، چھپ چھپ کے وار کیا
مردانِ حق نگر کی نظر میں تمام ہیچ
زنجیر کیا ، صلیب کیا ، زنداں و دار کیا
عہدِ وفا کیا ہے کوئی جرم تو نہیں
سمجھا رہا ہے مجھ کو مرا غم گسار کیا
ہر جسم بے لباس ہے ہر چہرہ بے نقاب
ہیں آنے والے دور کے یہ اشتہار کیا
ان سے عظیم تر ہے کہیں مقصدِ حیات
فکرِ معاش و کاوشِ عزّ و وقار کیا
ہونٹوں پہ میل جول کے نعرے ہیں پھر عزیز
ذہنوں میں پک رہا ہے کوئی خلفشار کیا

عزیز وارثی

(۱)

سینۂ شاعر غم سے بھرا ہے آنکھ مگر نمناک نہیں ہے
روزِ ازل سے ہے دیوانہ دامن لیکن چاک نہیں ہے
ہجر کے غم میں رونے والے تیرا الم دنیا کی نظر میں
کل بھی عبرتناک نہیں تھا آج بھی عبرتناک نہیں ہے
شکوہ بہ لب وہ رند ہیں ساقی آج بھی تیرے میخانے میں
تشنہ دہن بیٹھے ہیں لیکن عرضِ طلب بے باک نہیں ہے
شاعر کی آوارہ طبیعت اصل میں ہے تزئینِ محبت
ناصحِ مشفق تم سب کچھ ہو صرف یہی ادراک نہیں ہے
تو ہی بتا ہم ایسے انساں تیری گلی میں کیوں آتے ہیں
تیری ادائیں شوخ نہیں ہیں تیری نظر بے باک نہیں ہے
میں ہی کیا کچھ اور بھی تیرے میری طرح ہیں تیرے دوانے
پروانوں کی خاک میں شامل تنہا میری خاک نہیں ہے
تم نے عزیزؔ اُس کی محفل میں شب نہ سہی لمحے تو گزارے
مستقبل کی فکر تو کیوں ہو حال بھی حسرتناک نہیں ہے

(۲)

میں اگر صورتِ پروانہ فدا ہو جاتا
اُن کو اندازۂ آئینِ وفا ہو جاتا

اپنی قدرت سے لیا کام الٰہی تو نے
ورنہ اس دور کا ہر شخص خدا ہو جاتا

ہم نے تقدیر کے مفہوم کو سمجھا ورنہ
ہم کو بھی شکوۂ اربابِ جفا ہو جاتا

تم اگر دیکھنے والے کو نظر آ جاتے
حشر سے پہلے ہی اک حشر بپا ہو جاتا

اپنے گلشن کو وہ دوزخ نہ سمجھتا شاید
ایک گوشہ بھی جو فردوس نما ہو جاتا

تو نے پہچان لیا عشق کی قدروں کا مزاج
یہ نہ پوچھ آج تری بزم میں کیا ہو جاتا

اپنی غیرت سے بچائے رہا اپنے کو عزیزؔ
ورنہ احباب کے ہاتھوں ہی فنا ہو جاتا

۴

درد جب عشق میں مائل بہ فغاں ہوتا ہے
وہی عالم تو طبیعت پہ گراں ہوتا ہے

معجزہ عشق کا اس وقت عیاں ہوتا ہے
اُس کی تصویر پہ جب اپنا گماں ہوتا ہے

اب تو ہر بزم میں حال اپنا بیاں ہوتا ہے
کون اب کس کے لیے گریہ کناں ہوتا ہے

جب کبھی تذکرۂ گل بدناں ہوتا ہے
رہگزاروں پہ بہاروں کا گماں ہوتا ہے

چاندنی رات میں جب ہوتے ہیں وہ میرے قریب
وہی عالم تو محبت میں جواں ہوتا ہے

کس قدر پی ہے کہاں پی ہے کہاں تک پی ہے
پینے والے کو یہ احساس کہاں ہوتا ہے

۴

خوشی کے لفظ بھی کچھ غم کے افسانے میں رکھ دیتا
بالفاظِ دگر کعبے کو بت خانے میں رکھ دیتا

کبھی بیمارِ الفت پر نگاہِ لطف فرما کر
بنائے گلستاں اے دوست ویرانے میں رکھ دیتا

عنایت ہو سرِ محفل مگر بے التفاتی سے
غرض کچھ تلخیٔ غم میرے پیمانے میں رکھ دیتا

ادھر بیباک نظریں ہوں ادھر دُزدیدہ نظریں ہوں
ذرا سا فرق اپنے اور بیگانے میں رکھ دیتا

عزیزِ وارثی منظور ہو جب دل کا نذرانہ
حضورِ حُسن اپنی جان شکرانے میں رکھ دیتا

علیم اختر

(۱)

ہر ایک چیز کو حیرت سے تک رہا ہوں میں
یہ تم ہو سامنے یا خواب دیکھتا ہوں میں
ترے خیال میں کس درجہ کھو گیا ہوں میں
یہ کیا کہ تجھ کو بھی تجھ سے ہی پوچھتا ہوں میں
قدم قدم پہ زمانہ مٹا رہا ہے مگر
وہ نقش ہوں کہ ابھرتا ہی جا رہا ہوں میں
زمانہ ساز نگاہوں کی تلخیاں ساقی
یہ زہرِ غم تو کئی بار پی چکا ہوں میں
مآلِ کارِ گلستاں سے بے خبر ہو کر
پھر آج ایک نشیمن بنا رہا ہوں میں
یہ آزمائشِ صبر و قرار ہے اختر
کسی کے وعدۂ فردا کو جانتا ہوں میں

(۲)

محبت کا رگ و پے میں مری روحِ رواں ہونا
مبارک ہر نفس کو اک حیاتِ جاوداں ہونا

یہ حالت ہے کہ بیداری بھی ہے اک خواب کا عالم
معاذاللہ اپنا خوگرِ خواب گراں ہونا

اسے خوش کر سکیں گی کیا بہاریں زندگانی کی
چمن میں جس نے دیکھا ہے بہاروں کا خزاں ہونا

جو بارِ قسمتِ ترے غم کی مسرت سے ہیں ناواقف
وہ کیا جانیں کسے کہتے ہیں دل کا شادماں ہونا

مجھے آنکھیں دکھائے گی بھلا کیا گردشِ دوراں
مری نظروں نے دیکھا ہے ترا نامہرباں ہونا

جبین و آستاں کے درمیاں سجدے ہوں کیوں حائل
جبیں کو ہو میسر کاش جذبِ آستاں ہونا

ہوس کارانِ عشرت آہ کیا سمجھیں گے اے اخترؔ
بہت دشوار ہے ذوقِ الم کا رازداں ہونا

(۳)

نگاہِ لطف کیا کم ہو گئی ہے
محبت اور محکم ہو گئی ہے
مآلِ ضبطِ پیہم ہو گئی ہے
مسرت حاصلِ غم ہو گئی ہے
تمنا جب بڑھی ہے اپنی حد سے
تو مایوسی کا عالم ہو گئی ہے
نہ جانے کیوں عداوت ہی عداوت
سرشتِ ابنِ آدم ہو گئی ہے
ہے محوِ رقص ہر برگِ چمن پر
بڑی بے باک شبنم ہو گئی ہے
ہنسی ہونٹوں پر آتے آتے اخترؔ
پیامِ گریۂ غم ہو گئی ہے

۴

عشق میں اب یہ عالمِ دل ہے
ایک اجڑی ہوئی سی محفل ہے

اللہ اللہ کمالِ شوقِ دید
قیس کی ہر نگاہِ محمل ہے

تری محفل میں تھی نہ جس کی جگہ
آج اس دل میں تیری محفل ہے

سانس جب تک ہے آس ہے باقی
یاس تو زندگی میں مشکل ہے

تیرے سجدوں میں اے جبینِ نیاز
کوئی سجدہ بھی ان کے قابل ہے

جلوۂ حسن آنکھ کیا دیکھے
آنکھ خود اک حجابِ حائل ہے

اے زہے عشق کائناتِ حیات
ہر نفس کو دوام حاصل ہے

ہمّت عشق کچھ وفا سے نہیں
اس میں تیری جفا بھی شامل ہے

کہتے ہیں زندگی جسے اختر
خواب ہے یا خیالِ باطل ہے

(۵)

دل کو شائستۂ احساسِ تمنا نہ کریں
آپ اس اندازِ نظر سے مجھے دیکھا نہ کریں
ان کو یہ فکر ہے اب ترکِ تعلق کر کے
کہ ہم اب پرسشِ احوال کریں یا نہ کریں
ہاں مرے حال پہ ہنستے ہیں زمانے والے
آپ تو واقفِ حالات ہیں ایسا نہ کریں
ان کی دزدیدہ نگاہی کا تقاضا ہے کہ اب
ہم کسی اور کو کیا خود کو بھی دیکھا نہ کریں
اس میں پوشیدہ ہے پندارِ محبت کی شکست
آپ مجھ سے بھی مرے حال کو پوچھا نہ کریں
نہ رہا تیری محبت سے تعلق، نہ سہی
نسبتِ غم سے بھی کیا خود کو پکارا نہ کریں
ہیں کہ خود اپنی وفاؤں پہ خجل ہوں اختر
وہ تو لیکن ستم و جور سے توبا نہ کریں

عنوان چشتی

(۱)

شب کو جاگنا دن کو سونا تیرے نام
خوابوں کو پلکوں میں پرونا تیرے نام

تنہائی ہو یا سناٹا تیرے لیے
روح کا پارہ جسم کا سونا تیرے نام

اپنے پرائے غم ہیں ہزاروں دل ہے ایک
کوزے میں دریا کو سمونا تیرے نام

یوں ہی کیا کم بوجھ تھا تن کی مٹی کا
من کی چادر غم سے بھگونا تیرے نام

تجھ کو دیکھ کے غیر کو دیکھوں ناممکن
سوئیاں آنکھوں میں چبھونا تیرے نام

میرے لیے ہے اسمِ اعظم نام ترا
اپنے نام سے وحشت ہونا تیرے نام

راہِ طلب میں ہوش نہیں ہے سجدوں کا
سمتوں کا احساس بھی کھونا تیرے نام

قتل بھی میں قاتل بھی میں مقتول بھی میں
ہاتھ اپنے ہی خون سے دھونا تیرے نام

اول و آخر ظاہر و باطن اللہ ہو
میرا ہونا اور نہ ہونا تیرے نام

(۲)

وہ سوچتا ہے کہ سارا جہان سالم ہے
کہ جس کے سر پہ ابھی سائبان سالم ہے
وہ خوش ہے یار، ہمارا معاوضہ دے کر
کہ جس کی جان سلامت، مکان سالم ہے
خبر یہ ہے پسِ طوفان بھی شہرِ کہنہ میں
ضمیر بیچنے والی دکاں سالم ہے
بکھر گئی ہے یہاں فرد کی اکائی تک
انھیں یہ ضد ہے کہ ہر خاندان سالم ہے
فقیہِ شہر سے کہہ دو ثبوتِ حق کے لیے
زباں دو نیم ہے لیکن بیان سالم ہے
کس احتیاط سے آیا ہے شہر میں طوفاں
مکیں بچا نہیں، لیکن مکان سالم ہے
زمینِ درد پہ عنوان ہے اساس اس کی
کہ زلزلوں میں بھی دل کا مکان سالم ہے

۳

تعصب کی فضا میں طعنۂ کردار کیا دیتا
منافق دوستوں کے ہاتھ میں تلوار کیا دیتا

امیرِ شہر تو خود زرد رُو تھا ایک مدت سے
جھروکے سے وہ اہلِ شہر کو دیدار کیا دیتا

ہمارے دن کو جو دیتا نہیں اک دھوپ کا ٹکڑا
ہماری رات کو وہ چاند کا معیار کیا دیتا

خود اس کا سایہ بھی اس سے گریزاں ہے مصیبت میں
میرا ہم سایہ مجھ کو سایۂ دیوار کیا دیتا

بہت دشوار ہے خود دار ہو کر زندگی کرنا
خوشامد کرنے والا صدقۂ دستار کیا دیتا

یہ جبرِ شہر ہے عنوان انساں پر کہ بچّوں کو
محبت بھی نہ دے پایا تو پھر اقدار کیا دیتا

(۴)

بجھی بجھی جو ہیں آنکھیں تو اس میں حیرت کیا
نگاہِ بخل میں دریا دلی کی قیمت کیا
کہاں کا روح تماشا بدن شریعت کیا
نہ آدمی سے ہو رشتہ تو پھر محبّت کیا
زمین پر ہو کرشمہ تو کچھ یقیں آئے
طلوعِ مہر کی افلاک پر بشارت کیا
جو شمر ہو تو رجز میں بھی لطف آتا ہے
نہ ہو جو وہ تو کوئی جنگ کیا شہادت کیا
رگوں میں درد کی سرگوشیاں سی ہوتی ہیں
لہو کی ضد ہے فقط، پیار کیا محبّت کیا
یہ کیا کہ غیر رہیں اور تیرے کہلائیں
اگر یہ سچ ہے تو ہم کیا ہماری نسبت کیا
جو تم ہو ساتھ تو چاروں طرف اجالا ہے
اب اس سفر میں کسی اور کی ضرورت کیا

۵

ابھی سے نیزے پہ قرآن درمیان میں ہے
مرے حریف مرا تیر ابھی کمان میں ہے

عجیب شخص ہے جادو سا کیا بیان میں ہے
زبان اس کی ہے دل میں کہ دل زبان میں ہے

پہاڑ کاٹ رہا ہوں ترا شنے کے لیے
وہ اک شبیہ جو پنہاں کسی چٹان میں ہے

بلندیوں سے اترنے میں دیر ہو شاید
ہوس کا شوخ پرندہ بہت اڑان میں ہے

فغاں کہ ہاری ہوئی جنگ کے محاذ پہ ہوں
ہے تیر اپنا، مگر غیر کی کمان میں ہے

اسی کے دم سے بچی آبرو قبیلے کی
وہ ایک شخص جو آوارہ خاندان میں ہے

یہ ایک دوست نے لکھا ہے خط میں اے عنوان
تری جگہ مری پلکوں کے سائبان میں ہے

فریدی : مغیث الدین فریدی

(۱)

ہستی کے ہر اک موڑ پہ آئینہ بنا ہوں
مٹ مٹ کے ابھرتا ہوا نقشِ کفِ پا ہوں
وہ دستِ طلب ہوں جو دعا کو نہیں اٹھتا
جو لب پہ کسی کے نہیں آتی وہ دعا ہوں
رہ رہ کے کھٹکتا ہوں دلِ اہلِ ہوس میں
کانٹے کی طرح چبھتے ہی میں ٹوٹ گیا ہوں
اس دور میں انسان کا چہرہ نہیں ملتا
کب سے میں نقابوں کی تہیں کھول رہا ہوں
جاتی ہی نہیں دل سے تری یاد کی خوشبو
میں دورِ خزاں میں بھی مہکتا ہی رہا ہوں
رقصِ شررِ جاں دلِ گیتی کی ہے دھڑکن
میں اپنی بھی آواز ہوں سب کی بھی صدا ہوں
کیا عرضِ ہنر لفظ پرستوں میں فریدی
آئینے کے ہاتھوں پہ حنا باندھ رہا ہوں

(۳)

جہاں اگتی ہیں فصلیں خنجروں کی
وہیں بارش بھی ہوتی ہے سروں کی
پڑوسی کو جو طعنے دے رہے ہیں
خبر لیتے نہیں اپنے گھروں کی
پلٹ آتی ہیں نظریں چوٹ کھا کر
یہ کیا حالت ہوئی ہے منظروں کی
بتو چارہ گرو اس زندگی بھر
پرستش کر رہا ہوں نشتروں کی
مٹا جاتا ہے دل سے عکسِ ماضی
یہ بستی ہے شکستہ مقبروں کی
ہمارے دل کے ویرانے میں اب بھی
صدائیں گونجتی ہیں دلبروں کی
فریدی سخت جانی سے ہماری
مڑی جاتی ہیں دھاریں خنجروں کی

(۳)

جبیں پر شکن ہے نہ دامن پہ دھبّہ خرد کا ہر اک وار ہنس کر سہا ہے
جہاں سے ملا ہم کو سنگِ ملامت وہیں ہم نے اک آئینہ رکھ دیا ہے
کسی نے زبانِ تمنا نہ سمجھی، غلط فہمیوں سے بڑھی بے نیازی
ذرا جس کو چشمِ عقیدت سے دیکھا وہی رفتہ رفتہ خدا بن گیا ہے
کچھ اس طرح بدلی ہوا شہرِ دل کی دعا معصیت آرزو جرم ٹھہری
وفا سر بزانو ہے تیری گلی میں مذاقِ نظر سر برہنہ ملا ہے
تری رہگزر ہم سے روشن ہوئی ہے نشاں تیری منزل کا ہم بن گئے ہیں
یہاں کوئی نقشِ کفِ پا نہیں ہے وفا کے چراغوں کا اک سلسلا ہے
ہوا ہلکی ہلکی فضا بھیگی بھیگی یہ پچھلے پہر بھینی بھینی سی خوشبو
مرے دیدہ و دل کا عالم نہ پوچھو کوئی آرزو جیسے محوِ دعا ہے
نہ فکرِ ستم ہے نہ شکرِ کرم ہے نہ دل میں تڑپ ہے نہ ہے آنکھ پُرنم
نہ ذوقِ طرب ہے نہ شوقِ الم ہے نہ جانے محبت کو کیا ہو گیا ہے
فریدی کا دل بے نیازِ طلب ہے اسے طعنۂ نارسائی نہ دیجیے
کسی اور نشتر سے اب وار کیجیے یہ خنجر مرا آزمایا ہوا ہے

(۴)

ہم نے تنہانشینی خریدی تو ہے رونق و شورشِ انجمن بیچ کر
شمعِ محرابِ دل میں جلائی تو ہے آرزوؤں کا اپنی کفن بیچ کر
مطمئن ہیں بہت آج اربابِ فن اپنا سرمایۂ فکر و فن بیچ کر
جیسے آئینہ رکھ دے کوئی ماہ وش حلقۂ زلف کا بانکپن بیچ کر
کھو گیا دردِ ہنگامۂ شہر میں، لُٹ گئی ہے دکانِ متاعِ نظر
اب بھی توفیق اگر ہے تو اہلِ جنوں بڑھ کے لے لو اسے جان و تن بیچ کر
رُت بدلتی رہی رنگ اڑتے رہے کم نظر باغباں کم نظر ہی رہے
اک خیاباں کو سیراب کرتے رہے آبروئے بہارِ چمن بیچ کر
ہے فریدی عجب رنگِ بزمِ جہاں مٹ رہا ہے یہاں فرقِ سود و زیاں
نور کی بھیک تاروں سے لینے لگا آفتاب اپنی اک اک کرن بیچ کر

۵

غم دیدۂ تر مانگے ، فن فکر و نظر مانگے
آئینے کا دل مانگے پتھر کا جگر مانگے

آنچل اُسی قاتل کا ہر دیدۂ تر مانگے
نقشِ کفِ پا جس کا سجدہ نہیں سر مانگے

رفتارِ جہاں بدلی اندازِ جنوں بدلا
اڑتا ہوا ہر لمحہ صدیوں کا سفر مانگے

تنہائی میں گزری ہے اک ایسی شبِ غم بھی
جس شب سے اُجالے کی خیرات سحر مانگے

اس دورِ تجارت کے دستور نرالے ہیں
آئینے سے تابانی اب آئینہ گر مانگے

فلک: ہیرا لال فلک

(۱)

اشکِ غم وہ ہے جو دنیا کو دکھا بھی نہ سکوں
اور گر جائے زمیں پر تو اُٹھا بھی نہ سکوں
یہ مرے غم کا فسانہ ہے رہے گا لب پر
تیری روداد نہیں ہے کہ سُنا بھی نہ سکوں
پرتوِ حُسن ہوں اس واسطے محدود ہوں میں
حُسن ہو جاؤں تو دُنیا میں سما بھی نہ سکوں
تیز کچھ وقت کی رفتار نہیں ہے لیکن
تم اگر ساتھ نہ دو، پاؤں بڑھا بھی نہ سکوں
دل کہاں ایک سیہ خانہ ہے رنج و غم کا
اس قدر داغ لگے ہیں کہ مٹا بھی نہ سکوں
دل کی گہرائی سے اے دوست ذرا کہہ دو تو سہی
جان ایسی تو نہیں جس کو گنوا بھی نہ سکوں
عُمر گزری کبھی ساقی نے فلک یہ نہ کہا
اتنی پی لے کہ تجھے ہوش میں لا بھی نہ سکوں

۲

کوئے جاناں میں نہیں کوئی گزر کی صورت
دل اڑا پھرتا ہے ٹوٹے ہوئے پر کی صورت

ہم تو منزل کے طلب گار تھے لیکن منزل
آگے بڑھتی ہی گئی راہ گزر کی صورت

روح افسردہ ہے اور ذہن پراگندہ ہے
ایسی پہلے کبھی دیکھی تھی بشر کی صورت؟

بیٹھ جائیں کسی گوشے میں سمٹ کر اے دوست
کون گردش میں رہے شمس و قمر کی صورت

چند آنسو ہی مرے دل پہ فلک گر جائیں
آتشِ غم سے سلگتا ہے شرر کی صورت

قمر سنبھلی

۱

حرف آخری ہے جس پہ رقم وہ ورق بھی میں
سی پارۂ حیات کا پہلا سبق بھی میں

روشن یہ کائنات بھی میرے وجود سے
ہوں ماہتاب کی طرح اندر سے شفق بھی میں

میرے لہو کے فیض سے تابندہ شش جہات
خونِ جگر بھی، رنگِ حنا بھی، شفق بھی میں

ہر دل میں اک کھٹکتے ہوئے خار کی طرح
ہر لب پہ اک سلگتا ہوا حرفِ حق بھی میں

آکر ہوا ہے مجھ پہ ہی اوجِ ہنر تمام
پیشانیٔ حیات پہ پھیلا عرق بھی میں

منسوخ ہونے والے صحیفوں کا بھی امین
اور آخری کتاب کی تحریرِ حق بھی میں

چہروں کو پڑھ رہا ہوں بہت دیر سے قمر
محسوس کر نہ پایا وفا کی رمق بھی میں

(۲)

قصور سب ہے یہ نامعتبر علامت کا
الجھ کے رہ گیا مفہوم ہی عبارت کا
تمہارے سامنے منظر کہاں قیامت کا
عذاب سہتے کبھی کاش تم بھی ہجرت کا
قلم کے ساتھ زباں بھی تراش لو میری
یہ امتحان بھی لے لو! مری صداقت کا
کوئی سنائے تو آ کر حدیثِ شب زدگاں
ابھی بجھا نہیں شعلہ مری سماعت کا
مری حیات کی وسعت پہ ہو گیا ہے محیط
وہ ایک پل جو امیں ہے تری رفاقت کا
ہے ایک دانۂ گندم کی فتنہ سامانی
یہی ہے نکتۂ آغاز اپنی ہجرت کا
تباہیوں پہ قمرؔ چپ ہیں لوگ بستی کے
ہے انتظار ابھی شاید کسی کرامت کا

(٣)

سب تمھارے گاؤں کے منظر ہمیں اچھے لگے
بے ریا لہجوں سے روشن گھر ہمیں اچھے لگے

وہ بچھڑتے وقت کا منظر کہ اشکوں کے چراغ
تیری پلکوں کی منڈیروں پر ہمیں اچھے لگے

ہم ہوئے خوگر اذیت ناکیوں کے کس قدر
دور تک سڑکوں پہ بکھرے سر ہمیں اچھے لگے

پھول سا لہجہ بھی جس کا تھا طبیعت پر گراں
آج اُسی کے ہاتھ میں پتھر ہمیں اچھے لگے

یہ بھی ہے اس کی کرشمہ سازئ دستِ ہنر
خوبصورت تتلیوں کے پر ہمیں اچھے لگے

نیند اُچٹنے پر بکھرنے کا کوئی خطرہ نہیں
جاگتی آنکھوں کے خواب اکثر ہمیں اچھے لگے

جن میں شامل تھی نمی اپنے پسینے کی قمرؔ!
دانے گندم کے وہ منظر ہمیں اچھے لگے

(۴)

[illegible] توں کی مکمل کتاب لکھ دینا
سوال کرنے سے پہلے جواب لکھ دینا
[illegible]ست [illegible]ت کا مبہم عذاب لکھ دینا
وہ اس کی جاگتی آنکھوں میں خواب لکھ دینا
عجیب طرح بتاتا حیات کا مفہوم
وہ انگلیوں سے ہوا پر حباب لکھ دینا
ہمارے گھر کے چراغوں کا امتحاں ہی سہی
تم آندھیوں کے مسلسل عذاب لکھ دینا
سمندروں کی بھی وسعت جو پیاس سے کم ہو
ہمارے خونِ جگر کو شراب لکھ دینا
اگر نہیں شجرِ سایہ دار رستوں میں
سروں پہ جلتے ہوئے آفتاب لکھ دینا
عجیب ہے اسلوبِ خامشی اس کا
بس اک نگاہ میں دل کی کتاب لکھ دینا

قیصر حیدری

(۱)

جب تری زلفِ سیہ فام سنورتی ہوگی
کتنی دنیا ترے جلوؤں سے نکھرتی ہوگی
کتنی گہرائیوں میں ڈوبتی ہوگی ہستی
جب کوئی بات کسی دل میں اترتی ہوگی
اے مرے دل یہ غریب الوطنی کیسی ہے
کس کے پہلو میں تری رات گزرتی ہوگی
وقت کے سائے تو چڑھتے ہیں اتر جاتے ہیں
اپنے محور پہ کہاں دھوپ ٹھہرتی ہوگی
جس طرح رات گزر جاتی ہے تنہائی میں
غالباً ایسے ہی تربت میں گزرتی ہوگی
وہ مقدر نہیں الزام نہ جس پر آئے
قیصر اس دور میں کس طرح گزرتی ہوگی

۴

اس ہجومِ مہوشاں میں ہے تو مشکل ایک ہے
دل کے طالب یہ بھی وہ بھی آپ بھی دل ایک ہے

اختلافِ راہ پر شیخ و برہمن کے نہ جا
راستے سب کے جداگانہ ہیں منزل ایک ہے

جس میں رہنا چاہیے اس کو وہ دل ہے دل مرا
جس کو کہنا چاہیے محفل وہ محفل ایک ہے

دیر و کعبہ کیا گلستاں میں بھی ہے تیرا خیال
آج کل ہر حال میں کیفیتِ دل ایک ہے

تیرے در پر دیکھتے ہیں لوگ حیرت سے اسے
یعنی اپنی وضع کا قیصر بھی سائل ایک ہے

کامل قریشی

۱

چاک داماں بھی نہیں، تارِ گریباں بھی نہیں
ہم سا دنیا میں کوئی بے سروساماں بھی نہیں
حسرتِ مرگ میں مر مر کے جیے جاتے ہیں
موت مشکل تو نہیں ہے، مگر آساں بھی نہیں
شدتِ غم میں ہر اک چیز بھلا بیٹھے ہیں
ایسے عالم میں تری یاد کا امکاں بھی نہیں
عشق وہ زندہ حقیقت کہ مٹائے نہ مٹے
حُسن وہ قصہ کہ جس کا کوئی عنواں بھی نہیں
حسرتیں ہیں نہ تمنائیں نہ ارماں کامل
شہرِ دل سا تو کوئی شہرِ خموشاں بھی نہیں

(۲)

لیتا ہے سر آنکھوں پر اوروں کے جو غم تنہا
دیکھا ہے اسے اکثر با دیدۂ نم تنہا
خلوت میں بھی جلوت ہے جلوت میں بھی خلوت ہے
تنہا تو نہیں ہوتے، ہوتے ہیں جو ہم تنہا
ہم ہی تھے رہِ غم میں اک عمر گزار آئے
چل کر تو کوئی دیکھے دو چار قدم تنہا
خواہش نہ ہو رہبر کی حسرت نہ ہو منزل کی
مل جائے اگر ان کا، اک نقشِ قدم تنہا
ہم لوحِ مقدر پر تحریر ہیں قدرت کی
جو چاہے وہ لکھتا ہے یزداں کا قلم تنہا
بتخانہ و کعبہ سے پردہ جو اٹھا کامل
دونوں ہی جگہ نکلا وہ ایک صنم تنہا

۳

بکھرے بکھرے ہیں کسی شوخ کے بالوں کی طرح
ہم تو آوارہ ہیں شاعر کے خیالوں کی طرح

اتنی وحشت بھی نہیں خوب، غزالوں کی طرح
اب تو خوابوں میں بھی آتے ہو خیالوں کی طرح

ہاں کبھی ہم سے عبارت تھی کتابِ دنیا
آج پڑھتے ہیں ہمیں لوگ حوالوں کی طرح

کون ہیں کیا ہیں پتہ کیا ہے ہمارا، کیا نام
ہم ہیں اس شہر میں کچھ ایسے سوالوں کی طرح

بے نیازانہ گزر جاؤ ہر اک منزل سے
ٹھوکریں کھاؤ نہ در در کے سوالوں کی طرح

عیشِ دل، خندۂ لب، راحتِ جاں، روحِ حیات
شمعیں روشن ہیں یہ مانگے کے اجالوں کی طرح

ہم ہیں کس گنتی میں کامل نہ پیادے نہ سوار
ہم سے چلتے ہیں وہ شطرنج کی چالوں کی طرح

(۴)

ہم اپنے غم کی کبھی خود سے گفتگو کرتے
تمام عمر گزاری یہ آرزو کرتے
جگر کو خون تو دل کو لہو لہو کرتے
کسی طرح تو محبّت کو سرخرو کرتے

زبان ضبطِ مُسلسل سے بند ہے ورنہ
وہ دوستوں نے کیا ہے نہ جو عدو کرتے

نہ مسکرائیں کبھی نورِ صبح کی کرنیں
شبِ فراق جو گُل شمعِ آرزو کرتے

جو دیکھ لیتے تری مست انکھڑیاں میخوار
نہ خود کو غرقِ مے و شیشہ و سبو کرتے

تری تلاش نے فرصت نہ دی ہمیں اے دوست
کہ ہم ذرا کبھی اپنی بھی جستجو کرتے

حضور قیدیِ زنداں نہ کرتے کامل کو
اسیرِ سلسلۂ زلفِ مشک بو کرتے

کرشن موہن

(۱)

ہو گئے ہیں خشک سوتے کلپنا کے
کھو گئے ہیں گیت میری کامنا کے
ایک سُونا پن دھڑکتا ہے فضا میں
ہو گئے چُپ تار دل کے جھنجھنا کے
جب سپھل ہونے نہ پائی اپنے بل پر
کامنا میں رنگ آئے وندنا کے
کوئی بھی ارماں نہیں ہے میرے دل کو
بے حسی نے رکھ دیا پتھر بنا کے
ایشور سے وشو کا سُکھ مانتے ہیں
دُکھ بھرے یہ شبد میری پرارتھنا کے
سُکھ کے سپنے، متاؤں کے کھلونے
پھول ہیں یہ میرے من کے آنگنا کے
کیوں نہ پچھتاؤں سنورنا چاہتا ہوں
اشک تو موتی ہیں من کی چیتنا کے
دیکھ کر تیرا انوکھا روپ جوگی
بھول جائیں تپ اور تپ سادھنا کے
کرشن موہن یہ جبینوں کے پسینے
ہیں حقیقت میں نگینے پرریرنا کے

۲

دامنی بھی ایک چنچل کامنی تھی
مدبھری تیرے ملن کی یامنی تھی
سوچتی آنکھوں کی رنگت جامنی تھی
سُرمئی پلکوں کی سنگت کامنی تھی
مجھ کو بھی تڑپا گئی تھی خود تڑپ کر
تیری بے کل یاد بھی اک دامنی تھی
کیوں گری پاتال میں بے حال ہو کر
آتما میری گگن کی گامنی تھی
کرشن موہن اب کہاں وہ شوخ جوبن
کامنا جب اک دمکتی دامنی تھی

(۳)

باہر تو شاندار ہے اندر حقیر ہے
چہرے کا جو امیر ہے دل کا فقیر ہے
سمجھے ہے اپنے آپ کو معیارِ کائنات
ہر آدمی حصارِ انا میں اسیر ہے
تیرے مریضِ عشق کا یہ حال ہے کہ اب
ربِّ قدیر چارہ گر و دستگیر ہے
روکے ہر ایک گام پہ ہر کام سے ہمیں
آہنگِ کیف و رنگ کا دشمن، ضمیر ہے
مالِ خطیر جس کی ہے تقدیر، اِن دنوں
وہ شخص اس جہاں میں عظیم و شہیر ہے
میرا جُنوں ہے آپ ہی اپنا فسونِ شوق
تیرا شباب آپ ہی اپنی نظیر ہے

(۴)

ہو گئی اس قدر مسلط بھوک
پڑھنا لکھنا ہے آج کل متروک
موت سے زندگی ملے شاید
زندگی سے تو ہو گئی ہے چوک
اپنے اعمالِ زشت کے باعث
آدمی بن گیا ہے بچۂ خوک
میں جو پہنچا دیارِ پیری میں
سحر و شام دل سے اٹھی ہوک
میں تو اپنی ہی ذات میں گم ہوں
زندگی ہے کسی کا حُسنِ سلوک
آنسوؤں کی زباں سے بول اُٹھا
من کا سنتاپ رہ نہ پایا موک
ان دنوں شاہد و شراب کہاں
کرشن موہن ہے شاعرِ مفلوک

(۵)

زیب دیتی ہے تجھے توصیف اپنی
شاعرِ خوش فکر کر تعریف اپنی
دُور کر دیتی ہے ہر تکلیف اپنی
قلب کی تالیف ہے تصنیف اپنی
اپنے اعمالِ نکوہیدہ کے باعث
ہم نے کر لی آپ ہی تخویف اپنی
ہر نفس اہلِ ہوس کا سامنا ہے
زندگی ایثار کی توقیف اپنی
غیر کی تصنیف میں تنصیف کر کے
ہم بنا لائے ہیں اک تالیف اپنی
جو ہجومِ مہ وشاں میں گھومتے تھے
لائے ہیں وہ آج بس تشریف اپنی
صدر ہیں ہم آج اقلیمِ سخن کے
ہم نے کر لی آپ ہی تحلیف اپنی
نیک و بد میں بٹ گئے ہم کٹ گئے ہم
کب ہمیں تسلیم تھی تنصیف اپنی
کرشن موہن ہم زباں کے مجتہد ہیں
گوہرِ رخشاں ہے ہر تعریف اپنی

کمالؔ احمد صدیقی

۱

دل میں جو بات کھٹکتی ہے، دہن تک پہنچے
خامشی مرحلۂ عرضِ سخن تک پہنچے

محرمِ حُسنِ بہاراں تو نہیں ہو سکتی
وہ نظر، صرف جو گل ہائے چمن تک پہنچے

زندگی نام اُسی موجِ مئے ناب کا ہے
میکدے سے جو اُٹھے، دار و رسن تک پہنچے

گلستانوں کا اجارہ نہیں فصلِ گل پر
فصلِ گُل وہ ہے جو ہر دشت و دمن تک پہنچے

عہد ہم نے بھی کیا تھا، نہ ملیں گے اس سے
بار ہا ہم بھی اُسی عہد شکن تک پہنچے

بات کرتا ہے بظاہر بڑی سادہ سی کمالؔ
جو سخنور ہیں، وہی اس کے سخن تک پہنچے

(۲)

عروج اوروں کو کچھ دن ہے اہرمن کی طرح
فروغ کس کو ہے رندوں کے بانکپن کی طرح
مرا خیال نہیں ہے، تو اور کیا ہوگا
گزر گیا ترے ماتھے سے جو شکن کی طرح
یہ سرزمینِ گل ولالہ سو بھی جاتی ہے
لبادہ برف کا اوڑھے ہوئے کفن کی طرح
کبھی تو گزروں گا اس رہ گزار سے ہو کر
خود اپنی تاک میں بیٹھا ہوں راہزن کی طرح
خزاں کا خوف مجھے کھائے جا رہا ہے کمال
چنار سرخ نہ ہوں آتشِ سخن کی طرح

(۳)

باتیں جو تھیں درست پرانے نصاب میں
اُن میں سے ایک بھی تو نہیں ہے کتاب میں
محرومیوں نے بزم سجائی ہے خواب میں
سب کے الگ الگ ہیں مناظر سراب میں
پانی کی طرح اہلِ ہوس نے شراب پی
لکھی گئی ہے تشنہ لبوں کے حساب میں
سب نام ہیں درست، مگر واقعے غلط
ہر بات سچ نہیں، جو لکھی ہے کتاب میں
صد آتشہ اگر ہو، ترا رنگ روپ ہے
جو رنگ پھول میں ہے، نشہ ہے شراب میں
اُس کا تو ایک لفظ بھی ہم کو نہیں ہے یاد
کل رات ایک شعر کہا تھا جو خواب میں
کچھ شعر شاید اس کو پسند آ گئے کمال
ہونٹوں کے کچھ نشاں ہیں تمھاری کتاب میں

(۴)

میرا سر کب کسی دربار میں خم ہوتا ہے
کوچۂ یار میں لیکن یہ قدم ہوتا ہے
پُرسشِ حال بھی اتنی کہ میں کچھ کہہ نہ سکوں
اس تکلّف سے کرم ہو، تو ستم ہوتا ہے
شیخ میخانہ میں کرتا ہے ارم کی باتیں
اسی میخانہ کا اک گوشہ ارم ہوتا ہے
ایک دل ہے کہ اُجڑ جائے تو بستا ہی نہیں
ایک بُت خانہ ہے، اُجڑے تو حرم ہوتا ہے
راہ بر، راہ نوردی سے پریشاں ہے کمال
جس طرف جائیے، مرا نقشِ قدم ہوتا ہے

گلزار دہلوی

(۱)

عمر جو بے خودی میں گزری ہے
بس وہی آگہی میں گزری ہے
کوئی موجِ نسیم سے پوچھے
کیسی آوارگی میں گزری ہے
ان کی بھی رہ سکی نہ دارائی
جن کی اسکندری میں گزری ہے
آسرا اُن کی رہبری ٹھہری
جن کی خود رہزنی میں گزری ہے
آس کے جگنوؤ سدا اُس کی
زندگی روشنی میں گزری ہے
ہجر کے رنج و غم، معاذ اللہ
ایک شب اِک صدی میں گزری ہے
ہم نشینی پہ فخر کر ناداں
صحبتِ آدمی میں گزری ہے
یوں تو شاعر بہت سے گزرے ہیں
اپنی بھی شاعری میں گزری ہے!

(ق)

میرؔ کے بعد غالبؔ و اقبالؔ
اک صدا، اک صدی میں گزری ہے

(۲)

تہذیبِ حسن و رنگِ بہاراں لیے ہوئے
کانٹے بھی ہیں غرورِ گلستاں لیے ہوئے
جیسے کوئی نشے میں سُنے میرؔ کی غزل
آنکھیں ہیں وہ سرورِ غزالاں لیے ہوئے
گلگشت کو چمن میں وہ آیا ہے رشکِ گُل
چہرے پہ عکسِ لعلِ بدخشاں لیے ہوئے
ہیں کب سے منتظر ہوں تمھارے وُرُود کا
پلکوں پہ اپنی، جشنِ چراغاں لیے ہوئے
زلفِ سیاہ رُخ پہ ہے کاکل بھی خال پر
دامن میں کتنے ہندوہیں قرآں لیے ہوئے
کیا وقت قافلہ پہ پڑا ہے کہ بہرِ قتل
خنجر ہیں آستیں میں حُدی خواں لیے ہوئے
گلزارِ دہلوی کی غزل کی زبان کو
پھرتے ہیں شہر شہر زباں داں لیے ہوئے

(۳)

اس ستم گر کی مہربانی سے
دل الجھتا ہے زندگانی سے
خاک سے کتنی صورتیں ابھریں
دُھل گئے نقش کتنے پانی سے
ہم سے پوچھو تو ظلم بہتر ہیں
اِن حسینوں کی مہربانی سے
اور بھی کیا قیامت آئے گی
پوچھنا ہے تری جوانی سے
دل سُلگتا ہے اشک بہتے ہیں
آگ بجھتی نہیں ہے پانی سے
حسرتِ عمرِ جاوداں لے کر
جا رہے ہیں سرائے فانی سے
ہائے کیا دورِ زندگی گزرا
واقعے ہو گئے کہانی سے
کتنی خوش فہمیوں کے بت توڑے
تو نے گلزار خوش بیانی سے

(۴)

فلاحِ آدمیت میں صعوبت سہ کے مر جانا
یہی ہے کام کر جانا یہی ہے نام کر جانا
جہاں انسانیت وحشت کے ہاتھوں ذبح ہوتی ہو
وہاں تذلیل ہے جینا وہاں بہتر ہے مر جانا
یوں ہی دیر و حرم کی ٹھوکریں کھاتے پھرے برسوں
تری ٹھوکر سے لکھا تھا مقدر کا سنور جانا
سکونِ روح ملتا ہے زمانہ کو ترے در سے
بہشت و خلد کے مانند ہم نے تیرا در جانا
ہماری سادہ لوحی تھی خدا بخشے کہ خوش فہمی
کہ ہر انسان کی صورت کو مافوق البشر جانا
یہ ہے رندوں پہ رحمت روزِ محشر خود مشیت نے
لکھا ہے آبِ کوثر سے نکھر جانا سنور جانا
چمن میں اس قدر سہمے ہوئے ہیں آشیاں والے
کہ جگنو کی چمک کو سازشِ برق و شرر جانا
ہمیں خارِ وطن گلزار پیارے ہیں گُل تر سے
کہ ہر ذرّے کو خاکِ ہند کے شمس و قمر جانا

گوپال متل

۱

مصرف کے بغیر جل رہا ہوں
میں سونے مکان کا دیا ہوں
منزل ہے نہ کوئی جادہ پھر بھی
آشوبِ سفر میں مبتلا ہوں
محمل بھی نہیں کوئی نظر میں
صحرا کی بھی خاک چھانتا ہوں
منصور، نہ دعویِ انا الحق
سولی پہ مگر لٹک رہا ہوں
اے اہلِ کرم نہیں میں سائل
رستے میں یوں ہی کھڑا ہوا ہوں
اس شہر میں وضعِ کج کلاہی
میں واقعی درخورِ سزا ہوں
مشکل نہیں ترکِ عشق، لیکن
اس کا بھی مآل جانتا ہوں

(۲)

جو شعارِ لب ہے، موجِ نوبہارِ نغمہ ہے
خامشی بھی آپ کی آئینہ دارِ نغمہ ہے

گوش اک مدّت سے محرومِ سماعت ہے مگر
دل عجب ناداں ہے، اب تک اعتبارِ نغمہ ہے

فرق یہ ہے نطق کے سانچے میں ڈھل سکتا نہیں
ورنہ جو آنسو ہے دُرِّ شاہوارِ نغمہ ہے

منکرِ سازِ مسرت ہوں تو کافر ہوں مگر
ہم نفس مضرابِ غم پر انحصارِ نغمہ ہے

اے کہ شکوہ تھا تجھے سنگیں مزاجی کا مری
دیکھ اس پتھر میں بھی موجِ شرارِ نغمہ ہے

(۳)

فضول تھا گلۂ جورِ آسماں پیارے
زمین بھی تو نہیں گوشۂ اماں پیارے
ترا گلہ ہے نہ کچھ شکوۂ جہاں پیارے
ہمیں نے عمر گنوادی ہے رائیگاں پیارے
عجب نہیں جو نہیں فکرِ آشیاں مجھ کو
ہزار بار گری برقِ ناگہاں پیارے
کچھ اتنا سہل نہ تھا جادۂ جنوں اے دوست
ترا خیال رہا دل کا پاسباں پیارے
قدیم ہے مری طرزِ فغاں تو طعن نہ کر
وہی زمیں ہے وہی دورِ آسماں پیارے

(۴)

روشن اسی کی ضو سے شبستانِ زندگی
تیرا خیال، شمعِ فروزانِ زندگی
پھر میرے دل میں تازہ امنگوں کا ہے خروش
پھر تیرا غم ہے سلسلہ جنبانِ زندگی
جس کو تمھارا غم ہے، بڑا شاد کام ہے
یہ دردِ لا علاج ہے درمانِ زندگی
تو ہے تو اپنے بختِ رسا پر بھی ناز ہے
تیرے بغیر دل تھا پشیمانِ زندگی
تسلیم چیرہ دستیِ جورِ خزاں مگر
ویراں نہیں ہے پھر بھی گلستانِ زندگی

۵

کیفِ تمام و نورِ سراسر ہے چاندنی
کس کے فروغِ حُسن کا مظہر ہے چاندنی
گرتا ہو جیسے چاند سے نغموں کا آبشار
اس طرح کیف بار زمیں پر ہے چاندنی
جلوہ طراز بام پہ ہے کون رشکِ ماہ
وہ کثرتِ جمال ہے ششدر ہے چاندنی
گلشن میں کس کی زلفِ معنبر کھلی کہ آج
محسوس ہو رہا ہے معطّر ہے چاندنی
آرامِ جاں بھی، راحت قلب و نظر بھی ہے
کیا تیرے التفات کا پیکر ہے چاندنی
اب ضبط و احتیاط کا یارا نہیں رہا
تو ہم سفر ہے اور فسوں گر ہے چاندنی
اندیشۂ رقیب میں ہوں لاکھ ظلمتیں
نازاں ہیں ہم کہ اپنا مقدّر ہے چاندنی

گوہر دہلوی : دگمبر پرشاد جین

۱

ستم کوئی بہ عذرِ امتحاں باقی نہ رہ جائے
کوئی حسرت، نصیبِ دشمناں باقی نہ رہ جائے
کہیں اے سوزِ غم لب پر فغاں باقی نہ رہ جائے
یہ کیسی آگ ہے اس میں دھواں باقی نہ رہ جائے
اٹھاتے ہو مجھے در سے اٹھادو میں تو جب جانوں
مرے سجدے کا بھی در پر نشاں باقی نہ رہ جائے
الٰہی ایک ایسا انقلاب آئے زمانے میں
زمیں رہ جائے باقی، آسماں باقی نہ رہے
جفائیں کرتے کرتے اب وفاؤں پر اتر آئے
کوئی عنوانِ ظلم اے مہرباں باقی نہ رہے
ہماری زندگی میں تو نہ آئے کاش اے گوہر
وہ دن جس دن کہ یہ اردو زباں باقی نہ رہے

(۲)

نہ ہوگی ملتفت اب وہ نظر کیا
رہے گا دردِ دل بے چارہ گر کیا؟
پیامِ شوق اُن کو نامہ بر کیا
نہ ہوگی دل کو خود دِل کی خبر کیا
ہمیں کیا غم ہو بے بال وپری کا
نہ نکلیں گے کبھی پھر بال و پر کیا
حدودِ کعبہ وبت خانہ والو!
تمھاری وسعتِ قلب ونظر کیا
گھڑی ساعت کے ہیں مہماں دو لتوں
مریضِ عشق کیا شمعِ سحر کیا
زمانہ اُڑ رہا ہے پر لگا کر
زمانے کی تجھے گوہر خبر کیا

ماہرؔ: کیلاش ماہر

۱

جانے کیا سوچ کے ہم تجھ سے وفا کرتے ہیں
قرض ہے پچھلے جنم کا سو ادا کرتے ہیں

دل کے زخموں پہ نہ جاؤ کہ بڑی مدّت سے
یہ دیئے یوں ہی سرِ شام جلا کرتے ہیں

کیا ہوا جام اٹھاتے ہی بھر آئیں آنکھیں
ایسے طوفان تو ہر شام اٹھا کرتے ہیں

کون ہے جس کا مقدّر نہ بنی تنہائی
کیا ہوا ہم بھی اگر تجھ سے گِلا کرتے ہیں

رشتۂ درد کی میراث ملی ہے ماہرؔ
ہم ترے نام پہ جینے کی خطا کرتے ہیں

(۲)

پورب دیس کی یادیں لایا پھر موسم کا تیکھا پن
مجھ سے پہروں اُنس کرے ہے تنہائی کا سوناپن
دل کے رنگ محل میں جیسے برسوں کوئی نہ جھانکا ہو
تصویروں کی بے نور آنکھیں، شیشہ شیشہ دھندلا پن
کتنی بار لہو رویا ہے، کتنی بار جلے ہیں چراغ
کتنے غموں کی آنچ میں نکھرا درد کا میٹھا میٹھا پن
ہم ٹھہرے درویش جنم سے پیار کیا تو آ بیٹھے
ہم سے کیسی تیکھی نظریں ہم سے کیا بیگانا پن
انجانے لوگوں تک پہنچا ذکر تمھاری چاہت کا
گلی گلی مشہور ہوا ہے ماہر کا دیوانا پن

(۳)

خواب کی تعبیر کتنی احتمالی ہو گئی
زخم لو دینے لگے گھر میں دوالی ہو گئی

میں کوئی گوتم نہ تھا جو زندگی سے بھاگتا
میری ہر تصویر تصویرِ خیالی ہو گئی

یہ سلگتی روح کا تحفہ ہے کم ظرفی نہیں
جو دُعا تیرے لیے نکلی وہ گالی ہو گئی

تو نے وہ سوغات بخشی ہے جیتوں کے نام پر
میرا دامن دیکھ کر دنیا سوالی ہو گئی

وقت کی بے چہرگی دیکھی نہیں جاتی کہ اب
رات پیلی ہو گئی، ہر صبح کالی ہو گئی

کتنے ماہر خونِ دل سے پھر اُگائیں گے گلاب
ہم نہیں تو کیا زمیں کی گود خالی ہو گئی

(۴)

بھٹک رہا ہوں خلاؤں میں گم شدا کی طرح
سکوتِ سنگ نے ٹھکرا دیا صدا کی طرح

مرے وجود کو پگھلا رہی ہے برف کی آنچ
مگر وہ چپ سی لگی ہے مجھے خدا کی طرح

عجیب شہر ہے پرچھائیاں چمکتی ہیں
ہر اجنبی مجھے لگتا ہے آشنا کی طرح

چلا تھا گھر سے نکل کر پہاڑ کی جانب
پلٹ کے آگیا بستی میں پھر صدا کی طرح

دھری رہے گی یہ خوشبو کی کھوکھلی زنجیر
ہر ایک رنگ سے اڑ جاؤں گا ہوا کی طرح

گری تھی اوس جو کل شب بدن کے صحرا میں
یہ بات پھیل گئی شہر میں وبا کی طرح

ہمیں ہواؤں کی ٹھوکر بھی راس آ نہ سکی
پڑے ہیں وقت کے رستے میں نقشِ پا کی طرح

٥

دفتر میں بھی گُم صُم رہنا، شام سے تنہا ہو جانا
ہنستے ہنستے جام اٹھانا، پھر سنجیدا ہو جانا

صدیوں سے دل کے قصّے کی یہی روایت ہے یارو!
لفظ و بیاں کے پیکر تک، احساس کا ٹھنڈا ہو جانا

وہ انجانی صورت، دل میں چاند کا سایہ بن بیٹھی
ہوتے ہوتے ایک خلش کا حاصلِ دنیا ہو جانا

اونگھتی شب میں میرا پیچھا گھر گھر کرتی ہے رسوائی
مبہم سی دل کی چاہت کا جگ افسانا ہو جانا

کتنے موسم بیت گئے یہ جھیل نہ سوکھی آنکھوں کی
قطرۂ غم کا بڑھتے بڑھتے آگ کا دریا ہو جانا

محروم: تلوک چند محروم

۱

ہر سمت اک ظہور ہے تیرے جمال کا
تو نور، شرق و غرب و جنوب شمال کا
ماہِ تمام یم تبسّم ہے اک تیرا
خورشید ایک شمہ ہے تیرے جمال کا
پائی ہے تجھ سے چشم کواکب نے روشنی
تمغہ دیا ہے بدر کو تو نے کمال کا
دیتا ہے ناتواں کو توانائی عروج
اوجِ فلک سے ہے یہ اشارہ ہلال کا
تو ہے نہاں مگر ترے جلوے کہاں نہیں
ہر لخت سنگ آئینہ تیرے جمال کا
خود اس کے حُسن کو بھی تماشا کرے کوئی
صانع جو روئے گل کا ہے، جسمِ غزال کا
محرومؔ اک امید پہ ہوں گرمِ جستجو
"لاتقنطوا" جواب ہے میرے سوال کا

(۲)

ہمارے واسطے ہے ایک جینا اور مر جانا
کہ ہم نے زندگی کو جادۂ راہِ سفر جانا
یکایک منزلِ آفاتِ عالم سے گزر جانا
ڈریں کیوں موت سے جب ہے اسی کا نام مر جانا
تری نظروں سے گر جانا ترے دل سے اتر جانا
یہ وہ افتاد ہے جس سے بہت اچھا ہے مر جانا
تلاطم آرزو میں ہے نہ طوفاں جستجو میں ہے
جوانی کا اتر جانا ہے دریا کا اتر جانا
ہم اپنے رہزن و رہبر تھے لیکن سادہ لوحی سے
کسی کو راہزن سمجھے کسی کو راہبر جانا
میں ایسے راہ رو کی جستجو میں مر مٹا جس نے
تنِ خاکی کو راہِ عشق میں گردِ سفر جانا
نہ بھولے گا ہمیں محرومؔ، صبحِ روزِ محشر تک
کسی کا موت کے آغوش میں وقتِ سحر جانا

۳

جس پہ رندوں کو گمانِ لغزشِ شکرانہ تھا
پائے ساقی پر وہ اپنا سجدۂ شکرانہ تھا
نام کوثر رکھ دیا ہم نے چھپانے کے لیے
بزمِ واعظ میں بھی ذکرِ عشرتِ میخانہ تھا
بے تحاشا کون پڑتا ہے پرائی آگ میں
سر دالفت کا ہیولیٰ تھا کہاں پروانہ تھا
سرد مہری ہائے خوباں سے ٹھٹھر کر رہ گیا
ورنہ دل اپنا شرارِ ذوقِ بے تابانہ تھا
وصل سے کچھ بھی نہ تھی کم رونقِ شب ہائے ہجر
شمعِ شامِ غم، خیالِ جلوۂ جانانہ تھا
وسعتِ وحشت کی تجھ سے کیا کہیں اے قیس ہم
جو ترا ویرانہ تھا، اپنا وہ خلوت خانہ تھا
بختِ خوابیدہ کی تاثیرِ نہاں سے سو گئے
ورنہ خواب اور کہاں محروم کا افسانہ تھا

(۴)

حیرت زدہ میں ان کے مقابل میں رہ گیا
جو دل کا مدعا تھا، مرے دل میں رہ گیا
خنجر کا وار کرتے ہی قاتل رواں ہوا
ارمانِ دید، دیدۂ بسمل میں رہ گیا
جتنی صفا تھی سب رخِ جاناں میں آگئی
"جو داغ رہ گیا مہِ کامل میں رہ گیا
اے ہم رہانِ دشت محبّت چلے چلو
اپنا تو پائے شوق سلاسل میں رہ گیا
محروم دل کے ہاتھ سے جاں تھی عذاب میں
اچھا ہوا کہ دوست کی محفل میں رہ گیا

(۵)

پردا جو اٹھے تری جبیں کا
شرمندہ ہو چاند چودہویں کا
کم بخت کے پیچھے کس کو بھیجوں
قاصد بھی تو ہو رہا وہیں کا
دے ہاتھ سے گر وہ رشکِ شیریں
ہو زہر میں لطف انگبیں کا
حیرت میں ہوں دیکھ بت کدے کو
اللہ! یہ گھر ہے کس مکیں کا
دیکھو تو ضیائے ماہ و خورشید
پر تو ہے تمام اک حسیں کا
آرام کہیں نہیں ہے دل کو
ہر وقت خیال ہے وہیں کا
تربت پہ مری اُگے گی سنبل
کشتہ ہوں میں زلفِ عنبریں کا
ہے روزِ ازل سے تیرا قسمت
عاشق تری چشمِ سرمگیں کا
محروم ہے، اور بے خودی ہے
دنیا کا خیال ہے نہ دیں کا

محسن زیدی

۱

یہ تو نہیں اب اور ستم گر نہ آئیں گے
لیکن تمھارے قد کے برابر نہ آئیں گے

اس بار کھو دیا تو ملیں گے نہ ہم تمھیں
اب کے جو ہم گئے تو پلٹ کر نہ آئیں گے

کیا یہ لہو کا دور مرے سر پہ ختم ہے
کیا دوسروں کے سر پہ یہ خنجر نہ آئیں گے

ہم نے بھی کوئی گل تو نہ پھینکے تھے اس طرف
پتھر کے کیا جواب میں پتھر نہ آئیں گے

چہرے ستم گروں کے تو کیا ہوں گے بے نقاب
ان کے تو نام بھی سرِ محضر نہ آئیں گے

آئیں گے ہم بتاتے ہوئے اپنے نقشِ پا
چل کر کسی کے نقشِ قدم پر نہ آئیں گے

محسن یہ دور ختم سمجھئے، اب اس کے بعد
گردش میں یہ پیالہ و ساغر نہ آئیں گے

(۲)

یاں کوئی شاخِ وفا پھولنے پھلنے سے رہی
شہرِ کوفہ کی روایت تو بدلنے سے رہی
میں ہوں اور وادئ غربت کا سفر ہے پیہم
اب کوئی روکے، مری راہ بدلنے سے رہی
مختصر یہ کہ اسی طرح جُھلستے رہیے
ابر آنے سے رہا دھوپ کبھی ڈھلنے سے رہی
کیسۂ زر سے سبھی بولتے مُنھ بند ہوئے
اب کسی مُنھ سے کبھی حق بات نکلنے سے رہی
کسی تدبیر سے گرماؤ دلوں کو ورنہ
درمیاں برف جو حائل ہے پگھلنے سے رہی
وہ زمیں بوئے گئے دشنہ و خنجر جس میں
وہ کوئی لعل و جواہر تو اُگلنے سے رہی
محسنؔ اُس کو میں بہت جانتا پہچانتا ہوں
اُس کے بارے میں مری رائے بدلنے سے رہی

٣

رستے میں خاک ہو کے بکھرنا ضرور ہے
منزل تک اس عمل سے گزرنا ضرور ہے
جو سیڑھیاں لگا کے فلک پر پہنچ گئے
اک دن زمیں پہ اُن کو اُترنا ضرور ہے
تنکوں سے لوگ چاہے نشیمن بنا بھی لیں
تنکوں کو آندھیوں میں بکھرنا ضرور ہے
جس کو ہو خوف موت کا مانگے نہ زندگی
جینے کی آرزو میں تو مرنا ضرور ہے
جو چاہتا تھا چلتے رہیں راستے کے ساتھ
منزل اب آ گئی تو ٹھہرنا ضرور ہے

(۴)

چاروں طرف بلند نشاں تیرگی کا تھا
رکھا ہوا فصیل پہ سر روشنی کا تھا
کیا سوچ کر تم ایسے سفر پر نکل پڑے
امکاں نہ جس سفر سے کوئی واپسی کا تھا
یوں دم بہ دم چراغ کی لو ہو رہی تھی کم
جیسے ہر اک قدم سفرِ آخری کا تھا
میں کیوں نہ ٹوٹ جاتا حوادث کے بوجھ سے
اک بوجھ مجھ پہ یوں بھی مری زندگی کا تھا
آیا تھا لوٹنے مرا ہمزاد بھی مجھے
کس کو خیال، لوٹ میں ہمسائگی کا تھا
بڑھ کر وہاں بھی شب نے سیاہی انڈیل دی
ہلکا سا شائبہ بھی جہاں روشنی کا تھا
میری کتابِ شعر میں سادہ جو رہ گیا
محسن وہی ورق تو مری شاعری کا تھا

(۵)

کب گرفتار کسی قیدِ مکانی میں رہے
ہم تو بہتے ہوئے پانی تھے روانی میں رہے
کیسا جادو تھا کہ ہم بن گئے پتھر جیسے
کون سا نشہ تھا ہم جس کی گرانی میں رہے
اپنے وقتوں میں بھی ہم اپنے لیے جی نہ سکے
زندگی ہم تو تری مرثیہ خوانی میں رہے
داستانوں میں اُڑا دے نہ حقیقت میری
اصل کا رنگ بھی تھوڑا سا کہانی میں رہے
میرے اشعار کے پیکر میں سمو دے خود کو
قاصد کیوں کوئی الفاظ و معانی میں رہے
موجِ انفاس سے تھوڑا سا دھواں بھی اُٹھے
لطف آ جائے اگر آگ بھی پانی میں رہے
جن سے رنگین تھے دنیا کے فسانے محسنؔ
کتنے بے رنگ وہ خود اپنی کہانی میں رہے

(۱)

.دئی کا تذکرہ توحید میں پایا نہیں جاتا
ہاں میری رسائی ہے مرا سایا نہیں جاتا
رے ٹوٹے ہوئے پائے طلب کا مجھ پہ احساں ہے
ھارے در سے اُٹھ کر اب کہیں جایا نہیں جاتا
حبت ہو تو جاتی ہے محبت کی نہیں جاتی
ہ شعلہ خود بھڑک اٹھتا ہے بھڑکایا نہیں جاتا
قیری میں بھی مجھ کو مانگنے سے شرم آتی ہے
موالی ہو کے مجھ سے ہاتھ پھیلایا نہیں جاتا
بن تم سے عبارت ہے بہاریں تم سے زندہ ہیں
ھارے سامنے پھولوں سے مرجھایا نہیں جاتا
بت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں
ہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا
محبت اصل میں مخمور وہ رازِ حقیقت ہے
سمجھ میں آ گیا ہے پھر بھی سمجھایا نہیں جاتا

(۲)

کسے اپنا بنائیں کوئی اس قابل نہیں ملتا
یہاں پتھر بہت ملتے ہیں لیکن دل نہیں ملتا
محبّت کا صلہ، ایثار کا حاصل نہیں ملتا
وہ نظریں بار ہا ملتی ہیں لیکن دل نہیں ملتا
تمہارا روٹھنا تمہید تھی افسانۂ غم کی
زمانہ ہوگیا ہم سے مزاجِ دل نہیں ملتا
جہاں تک دیکھتا ہوں میں جہاں تک میں نے سمجھا ہے
کوئی تیرے سوا تعریف کے قابل نہیں ملتا
حرم کی منزلیں ہوں یا صنم خانے کی راہیں ہوں
خدا مِلتا نہیں جب تک مقامِ دل نہیں ملتا
مسافر اپنی منزل پر پہنچ کر چین پاتے ہیں
وہ موجیں سر پٹکتی ہیں جنھیں ساحل نہیں ملتا
ہم اپنا غم لیے بیٹھے ہیں اس بزمِ طرب میں بھی
کسی نغمے سے اب مخمور سازِ دل نہیں ملتا

(۲)

خدا جب تک نہ چاہے آدمی سے کچھ نہیں ہوتا
مجھے معلوم ہے میری خوشی سے کچھ نہیں ہوتا

محبّت جذبۂ ایثار سے پروان چڑھتی ہے
خلوصِ دل نہ ہو تو دوستی سے کچھ نہیں ہوتا

وہاں تیرا کرم، تیرا بھروسہ کام آتا ہے
جہاں مجبور ہو کر آدمی سے کچھ نہیں ہوتا

ضیائے شمس بھی موجود ہے نورِ قمر بھی ہے
بصیرت ہی نہ ہو تو روشنی سے کچھ نہیں ہوتا

غرض تیرے سوا ہر ایک کو مجبور پاتا ہوں
بھروسہ جس پہ کرتا ہوں اسی سے کچھ نہیں ہوتا

خود اپنے حال سے الجھے ہوئے ہیں تیرے دیوانے
ہنسے جائے زمانے کی ہنسی سے کچھ نہیں ہوتا

محبّت بدگماں ہو جائے تو زندہ نہیں رہتی
اثر دل پر تمھاری بے رخی سے کچھ نہیں ہوتا

(۴)

دلائل سے خدا تک عقلِ انسانی نہیں جاتی
وہ اک ایسی حقیقت ہے جو پہچانی نہیں جاتی
اسے تو راہ میں اربابِ ہمت چھوڑ دیتے ہیں
کسی کے ساتھ منزل تک تن آسانی نہیں جاتی
کسے ملتی ہیں وہ آنکھیں محبت میں جو روتی ہیں
مبارک ہیں وہ آنسو جن کی ارزانی نہیں جاتی
اُبھرتا ہی نہیں دل ڈوب کر بحرِ محبت میں
جب آجاتی ہے اس دریا میں طغیانی نہیں جاتی
گدائی میں بھی مجھ پر شانِ استغنیٰ برستی ہے
مرے سر سے ہوائے تاجِ سلطانی نہیں جاتی
مقیم دل ہیں وہ ارمان جو پورے نہیں ہوتے
یہ وہ آباد گھر ہے جس کی ویرانی نہیں جاتی
کچھ ایسا پرتوِ حسنِ ازل نے کر دیا روشن
قیامت تک تو اب ذرّوں کی تابانی نہیں جاتی
کچھ ایسے برگزیدہ لوگ بھی ہیں جن کے ہاتھوں سے
چھڑا کر اپنا دامن پاک دامنی نہیں جاتی
ہجومِ یاس میں بھی زندگی پر مسکراتا ہوں
مصیبت میں بھی میری خندہ پیشانی نہیں جاتی

۵

یہ تجھ سے آشنا دنیا سے بیگانے کہاں جاتے
ترے کوچے سے اٹھتے بھی تو دیوانے کہاں جاتے

قفس میں بھی مجھے صیّاد کے ہاتھوں سے ملتے ہیں
مری تقدیر کے لکھے ہوئے دانے کہاں جاتے

نہ چھوڑا ضبط نے دامن نہیں تو تیرے سودائی
ہجومِ غم سے گھبرا کر خدا جانے کہاں جاتے

میں اپنے آنسوؤں کو کیسے دامن میں چھپا لیتا
جو پلکوں تک چلے آئے وہ افسانے کہاں جاتے

تمھارے نام سے منسوب ہو جاتے ہیں دیوانے
یہ اپنے ہوش میں ہوتے تو پہچانے کہاں جاتے

اگر کوئی حریمِ ناز کے پردے اٹھا دیتا
تو پھر کعبہ کہاں رہتا صنم خانے کہاں جاتے

نہیں تھا مستحق مخمور رندوں کے سوا کوئی
نہ ہوتے ہم تو پھر لبریز پیمانے کہاں جاتے

مخمورؔ سعیدی

(۱)

رشتوں کی اک بھیڑ ہے میرے ساتھ مگر تنہا ہوں میں
کہہ نہ سکا جو درد کسی سے آج وہ تجھ سے کہہ دوں میں
کوئی گنہ بھی گنہ نہیں جو روحوں کو سرشار کرے
وہ میرے ہاتھوں کی عبادت تیرا بدن جب چھو لوں میں
بارش ہو نغمات کی مجھ پر جب اس کی آواز سنوں
جی یہ چاہے اس بارش میں جنم جنم تک بھیگوں میں
دل میں سو سو اندیشے ہوں جب وہ نظر سے اوجھل ہو
سامنے آ جائے تو سوچوں اس سے کیا کیا پوچھوں میں!
ہجر کی تلخی، قرب کا نشّہ دونوں جان کے دشمن ہیں
دل کتنی شدّت سے دھڑکے، کس مشکل سے سنبھلوں میں
منتظر اے مخمورؔ بہت دن سے میں اسی آواز کا تھا
اس کا بلاوا آ پہنچا ہے خود سے رخصت ہو لوں میں

(۲)

وہ، اور اس کا ایک ربطِ رائگاں، میں کون ہوں
دو پرانے دوستوں کے درمیاں میں کون ہوں
میں اندھیروں کا مسافر اس طرف کیوں آگیا
مجھ سے پوچھیں جگمگاتی بستیاں میں کون ہوں
کیوں ستاروں کی طلب میں کھو دیا اپنا بھرم
کیوں مری مٹھی میں آتا آسماں؟ میں کون ہوں
وہ برابر پیش قدمی کرنے والا کون تھا
پے بہ پے میرے لیے پسپائیاں، میں کون ہوں
کوئی گھر اس شہر میں بے سائباں دیکھا نہیں
میرا گھر کیوں رہ گیا بے سائباں، میں کون ہوں
اجنبی میرے لیے، خود میرے ہی دیوار و در
منحرف مجھ سے مری پرچھائیاں، میں کون ہوں
کب تک اپنے روز و شب سے خود ہی بیگانہ رہوں
کچھ بتا مجھ کو مری عمرِ رواں! میں کون ہوں
ہے مری حدِ رسائی تک مری پہچان کچھ
میں جہاں تک جا نہیں سکتا، وہاں میں کون ہوں
میں اُسے مخمورؔ اپنا کون سا چہرہ دکھاؤں
مجھ سے جب پوچھے وہ نا مہرباں، میں کون ہوں

۳

پار کرنا ہے ندی کو، تو اُتر پانی میں
بنتی جائے گی خود اک راہگذر پانی میں

ذوقِ تعمیر تھا ہم خانہ خرابوں کا عجب
چاہتے تھے کہ بنے ریت کا گھر پانی میں

سیلِ غم آنکھوں سے سب کچھ نہ بہا لے جائے
ڈوب جائیں نہ یہ خوابوں کے نگر پانی میں

کشتیاں، ڈوبنے والوں کے تجسّس میں نہ جائیں
رہ گیا کون، خدا جانے کدھر پانی میں

تو شناور ہی سہی، وقت کے طوفانوں کا
تُندیٔ موجِ بلا خیز سے ڈر پانی میں

اب جہاں پاؤں پڑے گا یہی دلدل ہوگی
جستجو خشک زمینوں کی نہ کر پانی میں

موج در موج، یہی شور ہے طغیانی کا
ساحلوں کی کیسے ملتی ہے خبر پانی میں

خود بھی بکھرا وہ، بکھرتی ہوئی ہر لہر کے ساتھ
عکس اپنا اُسے آتا تھا نظر پانی میں

کھیل میرے لیے موجوں کا تعاقب مخمورؔ
میں اتر جاؤں گا بے خوف و خطر پانی میں

(۴)

صبح کے اخباروں کی سُرخی بن کر شہر پہ چھائی آگ
آج یہ کیسا دن نکلا؟ کیوں سورج نے برسائی آگ
لوگ اپنے کاغذ کے مکانوں سے نکلے گھبرائے ہوئے
دروازوں پر خوف و خطر کی دستک دیتی آئی آگ
جگمگ کرتی ساری بستی آج دھوئیں کی دَلدَل ہے
شعلہ بہ کف اندھی آندھی نے چاروں طرف برسائی آگ
آگ کو دعوت دینے والو آؤ سمیٹو یہ سب کچھ
دھند، دھواں، بھگدڑ، بربادی کیا کیا تحفے لائی آگ
موسم کی اس طرفہ ادا پر غنچہ و گل سب حیراں ہیں
بھیگی بھیگی سرد ہوا کے جھونکوں نے بھڑکائی آگ
جلتے احساسات پہ چھڑکے غمخواری کی شبنم کون
وہ کہتے ہیں، اپنے گھروں کو ہم نے خود ہی لگائی آگ
ہم یہ نظارہ دیکھ کے خود ہی پل دو پل میں راکھ ہوئے
پھول تھے جن ہاتھوں میں اُنھی نے جب ہم پر برسائی آگ
اب میں کسے دامن میں جگہ دوں کس کی سمت بڑھاؤں ہاتھ
خالی دامن دیکھ کے میرا پھول ہنسے، للچائی آگ
اب تو اے مخمور یہ دل ہے ایک ٹھٹھرتا ویرانہ
سرد ہوئے احساس کے روشن انگارے کجلائی آگ

۵

نمودِ سوزِ جاں منظر بہ منظر
یہی شعلہ جواں منظر بہ منظر

پگھلتے آسماں جلتی زمینیں
فضا آتش فشاں منظر بہ منظر

ہوا میں رنگ بن کر تیرتے تھے
لہو کے کچھ نشاں منظر بہ منظر

الجھتی تھیں نگاہیں ہر قدم پر
بدلتا تھا سماں منظر بہ منظر

ہزیمت ہم سفر منزل بہ منزل
طبیعت سرگراں منظر بہ منظر

ستارے، چاند، سورج غنچہ و گل
ہجومِ دشمناں منظر بہ منظر

جہنم زار پس منظر میں لیکن
بہشتوں کا گماں منظر بہ منظر

عجب گھٹن سی اک سینہ بہ سینہ
عجب کہرا یہاں منظر بہ منظر

یہی بجھتی سلگتی سی فضا میں
یہی دھند اور دھواں منظر بہ منظر

مشیر جھنجھانوی

(۱)

اس چشمِ خود نگر کو طلب گار دیکھ کر
دل مطمئن ہے اپنا خریدار دیکھ کر
صحرا میں فکرِ سایۂ دیوار بھی نہ تھی
گھر یاد آ گیا در و دیوار دیکھ کر
محسوس یہ ہوا کہ سحر جھومنے لگی
اک مستِ خوابِ ناز کو بیدار دیکھ کر
ہے عالمِ سکوت مسلسل بہر طرف
دنیا ٹھہر گئی تری رفتار دیکھ کر
دل اک چراغ سرد ہے لیکن کبھی کبھی
لو دے اٹھے ہے شعلۂ رخسار دیکھ کر
دیوار گر پڑے گی اچانک خبر نہ تھی
ہم آ گئے تھے سایۂ دیوار دیکھ کر
اک بوجھ بن گئی ہے مری زندگی مشیرؔ
دل کے معاملات کو دشوار دیکھ کر

(۲)

کسی کی چشمِ کرم نے کب آسرا نہ دیا
ہمیں نے دردِ محبّت کا کچھ پتا نہ دیا

چلے تھے جانبِ ساحل بھنور سے گھبرا کر
خدا کا شکر کہ طوفاں نے راستا نہ دیا

ہم اور تجھ کو محبّت کا واسطا، ناصح
کبھی انھیں بھی محبّت کا واسطا نہ دیا

سنا ہے برق تڑپتی رہی گلستاں میں
کسی نے میرا نشیمن اُسے بتا نہ دیا

مسرّتوں نے تو چاہا کہ دل میں آ جائیں
ہجومِ غم نے مگر اُن کو راستا نہ دیا

تری جفا کے سہارے تو جی لیے کچھ دن
تری وفا نے تو اتنا بھی آسرا نہ دیا

گلوں کو رنگ، ستاروں کو نور، شب کو سحر
مشیرؔ اُن کے تبسّم نے کس کو کیا نہ دیا

(۳)

تری برق پاش نگاہ سے، ترے حشر خیز خرام سے
بہ سکونِ قلب گزر گیا میں ہر ایک ایسے مقام سے
وہ لجا گئے، وہ جھجک گئے، وہ ٹھہر گئے، کسی سوچ میں
سرِ رہ کسی نے جو دفعتاً انھیں دی صدا مرے نام سے
مری زندگی کے یہ مرحلے ہمہ بندگی ہمہ زندگی
مجھے کیف اُن کی نظر سے ہے کوئی واسطہ نہیں جام سے
نہ سمجھ سکا تری دشمنی نہ پرکھ سکا تری دوستی
مرا فیصلہ ہی بدل گیا تری ہر نظر کے پیام سے
ترا ذکرِ حسن کے تڑپ اٹھا، ترا نام لے کے میں رو دیا
مجھے ایک نسبتِ خاص ہے، ترے ذکر سے ترے نام سے
میں ہوں شمعِ محفلِ جاوداں، مری زندگی نہیں مختصر
میں چراغِ راہ گزر نہیں، جو بجھا بجھا سا ہو شام سے
نہ رہا مشیرؔ ہی تشنہ لب سرِ بزمِ ساقیِ بے خبر
کوئی بادہ کش نہیں مطمئن ترے میکدے کے نظام سے

(۴)

جب وہ مرے قریب سے ہنس کر گزر گئے
کچھ خاص دوستوں کے بھی چہرے اتر گئے
کشتی کوئی ڈبو کے سبک دوش ہو گیا
الزام جس قدر تھے وہ طوفاں کے سر گئے
کوئی ہمیں بتائے کہ ہم کیا جواب دیں
منزل یہ پوچھتی ہے کہ ساتھی کدھر گئے
وہ ہنس دیے تو رات سنورتی چلی گئی
زلفیں بکھیر دیں تو اُجالے نکھر گئے
افسوس ڈوبنے کی تمنّا ہی رہ گئی
طوفان زندگی میں جو آئے گزر گئے
حالانکہ ان کو دیکھ کے پلٹی ہی تھی نظر
محسوس یہ ہوا کہ زمانے گزر گئے
دیر و حرم میں ہیں، نہ کسی انجمن میں ہیں
دیوانے اے مشیرؔ نہ جانے کدھر گئے

(۵)

زہر اس ماحول کا مجھ میں کچھ اتنا بھر گیا
سانپ نے کاٹا مجھے اور کاٹتے ہی مر گیا
میں زمانے کی شرافت سے کچھ ایسا ڈر گیا
میرے اندر کا فرشتہ خوف کھا کر مر گیا
آئینہ ٹوٹا ہوا تھا یا خراشیں تھیں بہت
اپنا چہرا دیکھتے ہی میں اچانک ڈر گیا
بات سچی ہو تو باطل خوف کھاتا ہے ضرور
ایک موسیٰ کے لیے فرعون کا لشکر گیا
قتل کا الزام بھی جس پر لگا سکتے نہیں
مرنے والا ایک ایسا نام دے کر مر گیا
جسم بچ کر آ گیا یہ بھی غنیمت جانیے
ورنہ مقتل میں پہنچ کر کون واپس گھر گیا
ایک میں کوتاہ قد تھا اس کی محفل میں مشیر
اس لیے میرے علاوہ ہر کسی کا سر گیا

مضطر: پنڈت رام کرشن مضطر

(۱)

خونچکاں آج مرے دل کی صدا ہے تو سہی
تیری بیدادِ تغافل کا گِلا ہے تو سہی
تمتمانے لگے پھر لالہ و گل کے رخسار
کوئی شعلہ تہِ دامانِ صبا ہے تو سہی
خود بخود کوئی مری سمت کھنچا آتا ہے
حُسن بھی معتقدِ جذبِ وفا ہے تو سہی
کیا ہوا جور پسندی ہے اگر فطرتِ حُسن
عشق بھی خوگرِ تسلیم و رضا ہے تو سہی
جستجوئے حرم و دیر کروں کیوں اے دوست
بہرِ سجدہ ترا نقشِ کفِ پا ہے تو سہی
ہاں یہی سوچ رہا ہوں کہ سرِ جادۂ عشق
اک عجب مرحلۂ بیم و رجا ہے تو سہی
کرمِ دوست سے مایوس نہ ہو اے مضطر
التفاتِ نگہ ہوش ربا ہے تو سہی

۲

جلوۂ بزمِ طرب آئینۂ غم تو نہیں
ساغرِ مے بھی کہیں دیدۂ پُرنم تو نہیں

کوئی آواز پہ آواز دیے جاتا ہے
سوچتا ہوں یہ تری یاد کا عالم تو نہیں

یہ گھنی چھاؤں یہ ٹھنڈک یہ دل و جاں کا سکوں
میری آنکھوں پہ ترے گیسوئے پُرخم تو نہیں

لذّتِ درد وہی ہے وہی کیفیتِ زیست
التفاتِ نگہِ ناز ابھی کم تو نہیں

خود کو بھولے ہوئے دنیا سے گریزاں رہنا
یہ کہیں تیری محبّت ہی کا عالم تو نہیں

ڈبڈبا آئیں مجھے دیکھ کے آنکھیں اس کی
ہائے بے درد مرے درد کا محرم تو نہیں

رہ گئیں تھم کے یہ کس پر مری نظریں مضطر
روبرو آج وہی حسنِ مجسم تو نہیں

(۳)

کیا کیا وہ بھلائے ہوئے غم یاد نہ آئے
کیا کیا ترے احسان و کرم یاد نہ آئے
یہ نازِ تغافل کہ بانداز تغافل
کہتے ہیں وہ ہم سے تمھیں ہم یاد نہ آئے
کہتی رہی تاریک فضا درد کا قصّہ
عشرت کے فسانے شبِ غم یاد نہ آئے
کیا کم یہ نوازش ہے تری اے ستم دوست
اربابِ زمانہ کے کرم یاد نہ آئے
اے میرے غمِ عشق سلامت ترے ہوتے
دُنیا کے مجھے رنج و الم یاد نہ آئے
کس دن نہ رہا دل کو ترے رُخ کا تصوّر
کس رات تری زلف کے خم یاد نہ آئے
بھولے نہیں ہم جن کو کسی حال میں مضطر
افسوس کہ ان کو کبھی ہم یاد نہ آئے

(۴)

مری نگاہ میں یہ رنگِ سوز و ساز نہ ہو
ترے کرم کا اگر سلسلہ دراز نہ ہو
کسی نے توڑ دیے بربطِ حیات کے تار
اب اور کیا ہو اگر آہِ جاں گداز نہ ہو
نظر نہ آئے کہیں یہ بہار کا عالم
اگر تصوّرِ روئے چمن طراز نہ ہو
چلا تو ہے مگر اے رہروِ رہِ عرفاں
حقیقتوں کی بھی منزل کہیں مجاز نہ ہو
جو اس کے حُسن کی پرچھائیاں نہ آئیں نظر
تو روح، گرمِ طوافِ حریمِ ناز نہ ہو
ہے ایک فتنۂ بیدار حُسنِ خوابیدہ
سنبھل کے گھات میں وہ چشمِ نیم باز نہ ہو
شبِ فراق نہ کاٹے گئے کبھی مضطرؔ
خیالِ دوست اگر غم میں دل نواز نہ ہو

(۵)

بہاریں اور وہ رنگیں نظارے یاد آتے ہیں
وہ دلکش وادیاں وہ ماہ پارے یاد آتے ہیں
وہ موسم وہ سماں وہ دن وہ صبح وشام وہ راتیں
وہ ہنستے ناچتے گاتے ستارے یاد آتے ہیں
وہ جھیلیں وہ چمن وہ غنچہ و گل اور وہ سبزہ
مرے دل کو وہ منظر پیارے پیارے یاد آتے ہیں
مسرّت بخش تھا کتنا ترنّم آبشاروں کا
وہ لہریں وہ سکوں پرور کنارے یاد آتے ہیں
وہ جلوے حسن کے وہ شاہدِ رنگیں کی رعنائی
شبابِ کیف و مستی کے وہ دھارے یاد آتے ہیں
وہ زلفیں وہ ادائیں اور وہ رنگِ لب و عارض
غزالیں انکھڑیوں کے وہ اشارے یاد آتے ہیں
نشاطِ روح اے میری بہارِ زندگی مجھ کو
ترے پہلو میں جو لمحے گزارے یاد آتے ہیں

مظفر حنفی

۱

اودی کلیاں بھینی بیچل اگتا چاند کھنکتا پانی
سبز سمندر گوپی چندر بول مری مچھلی کتنا پانی

دو بونادوں کی حسرت نے کرچپ ٹیلے پر ریت کھڑی تھی
چاروں جانب گھنگرو باندھے رم جھم رم جھم برسا پانی

جی ہاں میں نے بھی دیکھا تھا اس کا کوئی دوش نہیں ہے
جب شعلوں کا ناچ ہوا تھا کافی دور کھڑا تھا پانی

سوکھی شاخیں سوچ رہی ہیں اب آنے سے کیا ہوتا ہے
پتے تالی پیٹ رہے ہیں، آیا پانی آیا پانی

پھلواری میں جھلمل جھلمل چاند کرن کب تک ٹھہرے گی
میں بس کے چکر میں بیٹھا کاٹ رہا ہوں کالا پانی

حال اندھیرا گھپ ہے لیکن، مستقبل کی آس کے جگنو
میری جلتی پیشانی پر ڈال رہے ہیں ٹھنڈا پانی

ایک لق ودق صحرا میں ہم دھوپ کے نیزے جھیل رہے ہیں
ہاتھوں میں چھوٹی سی رسی اور کنویں کا تارا پانی

اکثر اس کی یاد آتی ہے رو میں تیزی آجاتی ہے
وہ پربت کی اونچی چوٹی میں جھرنے کا بہتا پانی

(۲)

جھوٹ کہتے ہو کہ اونچا ہے تمہارا آسماں
ابتدا ہی سے مرے سرپر نہیں تھا آسماں
گھر ملا ہے جسم کے جنگل میں چودہ سال بعد
جس میں دو مٹھی ہوا ہے ہاتھ بھر کا آسماں
وہ مرا دن کے سمندر کو بلونا اور زہر
رات ہے، کف در دہن ہوں اور نیلا آسماں
کھینچ لیں میں نے طنابیں ورنہ برہم تھی زمیں
میں نہ ہوتا تو زمیں پر ٹوٹ پڑتا آسماں
چار سُو ہیں سرد چٹانیں، نکیلی، سنگلاخ
ہر طرف بے زار کُن ہموار بھورا آسماں
ریت پر بکھرے پڑے ہیں ان گنت خالی صدف
اور سر پر موتیوں کے تھال جیسا آسماں
کیوں مظفرؔ کس لیے بھوپال یاد آنے لگا
کیا سمجھتے تھے کہ دلّی میں نہ ہوگا آسماں

(۳)

میں گنہگار اور ان گنت پارسا چار جانب سے یلغار کرتے ہوئے
جیسے شب خون میں بوکھلا کر اٹھیں لوگ تلوار تلوار کرتے ہوئے
اُڑ رہی تھی وہاں گردِ تشکیک کی، آندھیاں تیز تھیں، طنز و تضحیک کی
راستے میں پڑا نیک نامی کا اک خوف آیا جسے پار کرتے ہوئے
وہ خراشیں دکھاتے رہے ہاتھ کی، سنگباری کے دوران آئی تھیں جو
ہم ادھر زخم سر کو چھپاتے رہے اور تزئینِ دستار کرتے ہوئے
بے رخی کی ہوائیں موافق نہ تھیں کیسے اخلاص کی کونپلیں پھوٹتیں
چار آنسو زمینوں کو نم کر گئے سرد لفظوں کو بے کار کرتے ہوئے
پھر چھٹی حِس نے پرچے لگائے بہت، آئینے عاقبت نے دکھائے بہت
بھائی نے آج کیوں مجھ کو دیکھا نہیں تاجپوشی کا دربار کرتے ہوئے
یہ زمانہ لگا ہے کہ اب جسم میں خار کے واسطے قطرۂ خوں نہیں
ایک وہ وقت بھی تھا کہ چلتے تھے ہم راستے بھر کو گلنار کرتے ہوئے
طرزِ تعمیر کے کچھ نئے زاویے، عصرِ نو کو مظفرؔ نے بخشے تو ہیں
اپنی ہی ذات پروار کرتے ہوئے اپنی ہستی کو مسمار کرتے ہوئے

(۴)

ہم زاد نت آئینہ دکھاتا ہے کہ میں ہوں
پھر کوئی لہو میں اتر آتا ہے کہ میں ہوں
دروازے پہ تحریر یہاں کوئی نہیں ہے
اندر کوئی زنجیر ہلاتا ہے کہ میں ہوں
ہر موڑ پہ اپنی ہی نفی کرتے ہوئے ہم
ہر سمت وہ آواز لگاتا ہے کہ میں ہوں
سر پر یہ گھٹا چھائی ہوئی ہے کہ تری یاد
سایہ سا کوئی راہ میں جاتا ہے کہ میں ہوں
ہر سانس پہ کٹنے کی صدا آتی ہے پیہم
یہ تیشہ ہمیشہ مجھے ڈھاتا ہے کہ میں ہوں
وہ برف کی دیوی ہے نہ ہونے کے برابر
ہر لمحہ مری آگ چراتا ہے کہ میں ہوں
عرفان کی یہ کون سی منزل ہے مظفر
کیوں خود سے بھی یہ بات چھپاتا ہے کہ میں ہوں

(۵)

فنا کے غار سے خواہش کے ملبے ہاتھ باہر تھے
کہ وہ دَلدَل میں سر تک دھنس چکے تھے ہاتھ باہر تھے
ہماری زندگی بھر پانو چادر سے رہے باہر
تعجب ہے سکندر کے کفن سے ہاتھ باہر تھے
سنو لوگو! ترا شا جا رہا ہے اختیار اس کا
چمن کی شاخ کی مانند اس کے ہاتھ باہر تھے
یہی ہونا تھا سب کی آستینیں خون میں تر ہیں
یدِ بیضا کے دعوے دار جتنے ہاتھ باہر تھے
میں اس کو روکتا کیسے، میں اس سے پوچھتا بھی کیا
کہ اس کی گود سے دو ننھے ننھے ہاتھ باہر تھے
ادھر نوچی کھسوٹی عورتیں، دہشت زدہ بچے
سلاخیں درمیاں تھیں کچھ لرزتے ہاتھ باہر تھے
مظفرؔ نے خطا کی ہے یقیناً ہاتھ پھیلا کر
مگر اس وقت جیبوں سے تمھارے ہاتھ باہر تھے

ملاؔ : پنڈت آنند نرائن ملاؔ

(۱)

اتفاقاً پسِ مدت جو وہ راہوں میں ملے
کتنی یادوں کے دیے جل کے نگاہوں میں ملے

کل تھے جب بام پہ بھولے سے نظر تک بھی نہ کی
آج کس پیار سے بولے جو وہ راہوں میں ملے

غم الگ سب کے مگر ایک ہے سب کا غمِ زیست
اپنے نالے بھی مجھے غیر کی آہوں میں ملے

ٹوٹے پھوٹے سے کھنڈر نیک ارادوں کے بھی کچھ
عمرِ رفتہ کو کریدا تو گناہوں میں ملے

کیسے ان راہ نماؤں پہ بھروسہ ہو کہ جو
کل سفیدوں میں تھے اور آج سیاہوں میں ملے

کسی گل میں بھی مہک اُس گلِ تر کی سی نہیں
جو کسی دل میں کھلے اور نگاہوں میں ملے

کارواں بن نہ سکا جب کہیں رہرو ہی نہ تھے
خضر ہی خضر ہر اک سُو ہمیں راہوں میں ملے

جبر سے لب تو سِلے، سینۂ انساں نہ سِلا
جو سخن گیت نہ بن پائے وہ آہوں میں ملے

نامۂ زیست سے اپنے نہیں ملاؔ میں خجل
چند بے لوث سے سجدے بھی گناہوں میں ملے

(۲)

چیز دل ہے ، رخِ گلفام میں کیا رکھا ہے
کیف صہبا میں ہے، خود جام میں کیا رکھا ہے
گنگناتا ہوا دل چاہیے جینے کے لیے
اس نزاعِ سحر و شام میں کیا رکھا ہے
کون کس طرح سے ہوتا ہے حریفِ مئے زیست
اور تلخابۂ ایام میں کیا رکھا ہے
عشق کرتا ہے تو کر اور نگاہوں کو بلند
رشتۂ رہ گزر و بام میں کیا رکھا ہے
حُسن فنکار کی اک چھیڑ ہے عشقِ ناداں
بے وفائی کے اس الزام میں کیا رکھا ہے
دیکھنا یہ ہے کہ وہ دل میں مکیں ہے کہ نہیں
چاہے جس نام سے ہو نام میں کیا رکھا ہے
دیں مرے ذوقِ پرستش کو دعائیں مُلّا
ورنہ پتھر کے ان اصنام میں کیا رکھا ہے

(۳)

غمِ انساں سے جو دل شعلہ بہ جاں ہوتا ہے
وہی ہر دور میں معمارِ جہاں ہوتا ہے
ہونٹ سیتے سے سوا سوزِ نہاں ہوتا ہے
شعلہ دبتا ہے تو کچھ اور دھواں ہوتا ہے
نعرۂ حق کو دباتے ہیں کھلی بزم میں جب
یہ کسی گوشۂ زنداں میں جواں ہوتا ہے
کون پتھر ہے گہر کون، پرکھنے کی ہے بات
دیکھنے ہی سے یہ اندازہ کہاں ہوتا ہے
عشق میں شکر و شکایت میں کوئی فرق نہیں
اپنا اپنا الگ اندازِ بیاں ہوتا ہے
میں بھی انصاف کا خواہاں ہوں مگر اے مالک
تیری دنیا میں اب انصاف کہاں ہوتا ہے
کون سا ہے یہ محبت میں مقام اے ملّا
کلمۂ لطف بھی اب دل پہ گراں ہوتا ہے

(۴)

نہیں میں پیار کے قابل تو مجھ کو پیار نہ کر
مگر نگاہِ ترحم سے شرمسار نہ کر

بدل نگاہِ غضب کو نہ تو تغافل سے
تعلقاتِ گوارا کو ناگوار نہ کر

اب اس قدر بھی نہ دنیا کو کم نگاہ سمجھ
غموں کو خندۂ باطل سے آشکار نہ کر

دیارِ حسن کی رنگینیاں قبول مگر
نگاہِ شوق کا جلدی سے اعتبار نہ کر

مآلِ زیست سے گھبرا کے کر نہ خونِ شباب
خزاں کے خوف سے رسوائیِ بہار نہ کر

خزاں رسیدہ چمن کی بہار ہی کیا ہے
مری بہار سے اندازۂ بہار نہ کر

جفائے دوست پہ شکوے نہ چھیڑ اے مُلّاؔ
عدو کے رنگ کو بھولے سے اختیار نہ کر

(۵)

تیرے خیال کے سوا، دل میں خیال کچھ نہیں
اپنی خوشی مجھے بتا، میرا سوال کچھ نہیں
آتشِ شوق تیز تر، آہنِ عزم سخت تر
جوشِ طلب کے سامنے امرِ محال کچھ نہیں
عشق تو ہے فنائے ذات، اس میں نہیں ہوس کی بات
روزِ خوشی نہ غم کی رات، ہجر و وصال کچھ نہیں
علم و خرد ہی ہر طرف تیغ و سناں لیے بہ کف
کیا دلِ دردمند کی آج مجال کچھ نہیں
ذہن میں ہے لچک وہی دل میں ہے تازگی وہی
ملّا ابھی وہی ہوں میں، مجھ میں زوال کچھ نہیں

ممتاز میرزا

۱

یہ رنگِ وفا، لطف کے انداز تو دیکھو
انجام ابھی دور ہے آغاز تو دیکھو
پھر جاگ اٹھی مردہ و خوابیدہ تمنّا
اک رشکِ مسیحا کا یہ اعجاز تو دیکھو
پھر دیدۂ و دل میں ہے وہی کیف کا عالم
جذب و اثرِ حُسنِ فسوں ساز تو دیکھو
اک جذبۂ بے نام لیے پھرتا ہے دل کو
اس طائرِ پربستہ کی پرواز تو دیکھو
ممتازؔ، ہر احساس کو بخشا ہے نیا روپ
یہ معجزۂ عشقِ صنم ساز تو دیکھو

۲

یہ میں نے کیا کیا کہ جفا اور بڑھ گئی
جرمِ وفا کے بعد سزا اور بڑھ گئی

گل ہائے رنگ رنگ ہیں، ان کو نہیں ثبات
چپکے سے یہ صبا نے کہا، اور بڑھ گئی

اک برقِ جاں فروز مرے آشیاں کے پاس
ٹھہری بس اک ذرا کی ذرا اور بڑھ گئی

اے ربِّ دو جہاں، تری رحمت کے میں نثار
کس جرم کی بنا پہ سزا اور بڑھ گئی

ممتازؔ، یوں تو بزم میں لاکھوں چراغ ہیں
آنے سے تیرے کچھ تو ضیا اور بڑھ گئی

(۳)

محرومیِ دوام پہ نازاں کوئی تو ہو
اے دل جفائے دوست کے شایاں کوئی تو ہو
آخر کسی کو کہہ تو سکیں رفتۂ بہار
پھولوں کی طرح چاک گریباں کوئی تو ہو
برقِ چمن کو ہم سے عداوت نہیں مگر
ایامِ گل میں سوختہ ساماں کوئی تو ہو
کوئی کلی تو کھل کے ہنسے صحنِ باغ میں
اے دل حریفِ گردشِ دوراں کوئی تو ہو
رسوائیاں کہ دار و رسن یا درِ حبیب
ممتازؔ اپنی زیست کا عنواں کوئی تو ہو

منوؔر لکھنوی: بشیشور پرشاد

(١)

ہر اک کے تجربے سے مختلف ہے تجربہ تیرا
نہ کیوں سب سے الگ ہو زندگی پر تبصرہ تیرا

نہیں معلوم کتنی مرتبہ مرنا پڑا مجھ کو
جیے جانا مرا ہر حال میں ہے معجزہ میرا

میری ہستی نہیں محدود ہرگز چند لمحوں تک
ازل سے تا ابد جاری رہے گا سلسلہ میرا

یہ مجھ سے مشورہ کیوں ہے مری قسمت کے بارے میں
تمھارا فیصلہ جو ہے وہی ہے فیصلہ میرا

منوؔر پہلے اپنے ذوق پر تنقید فرما لیں
میرے احباب ناحق لے رہے ہیں جائزہ میرا

۲

سوز سے ساز ہی نہیں حال ہے کچھ عجب ترا
میں تو نیاز مند ہوں ناز ہے بے سبب ترا
عشوہ کامیاب ہے جو بھی ہے بے حساب ہے
رحم تیرا کرم ترا ۔ قہر ترا غضب ترا
میں تو ہوں نقشِ زیرِ گام جانتا ہوں ترا مقام
مجھ پہ یہ کیا ہے اتہام میں نہ کروں ادب ترا
جانے کی طرح جائے گی جان یہ کب ترے لیے
آنے کی طرح آئے گی مجھ کو خیال کب ترا
دستِ دعا نہ پاس ہے بخت رسا نہ ساتھ ہے
کیوں ہو منوّر حزیں بندۂ منتخب ترا

(۳)

سر سے ہوائے عالمِ فانی چلی گئی
میں جس سے تھا سبک وہ گرانی چلی گئی
جب دل میں حوصلے تھے امنگوں میں جان تھی
وہ عمر کٹ گئی وہ جوانی چلی گئی
اب ہے خیال و خواب وہ موجوں کا پیچ و تاب
دریائے زندگی سے روانی چلی گئی
ہلکی سی ٹیس بھی ہے طبیعت کو ناگوار
وہ آرزوئے دردِ نہانی چلی گئی
عمرِ رواں کو تھا مری روداد سے گریز
ظالم سنا کے اپنی کہانی چلی گئی

۴

بتاؤں کیا کہ غرض کیا سفر میں رکھتا ہوں
یہی بہت ہے کہ منزل نظر میں رکھتا ہوں

میری حیات کا میری بقا کا ضامن ہے
وہ ایک درد جو پیہم جگر میں رکھتا ہوں

سبک نگاہ نہیں میرے مول سے واقف
بہت گراں ہے وہ سودا جو سر میں رکھتا ہوں

مری روش سے سمجھ لے نہ کوئی غیر مجھے
سنبھل کے پاؤں خود اپنے ہی گھر میں رکھتا ہوں

ابھی سلیقۂ تعمیر خام ہے شاید
ابھی یقین، میں دیوار و در میں رکھتا ہوں

مآل کار کی اب شکل دیکھیے کیا ہو
جنوں کا ہاتھ کفِ چارہ گر میں رکھتا ہوں

نگاہ میں ہے منوّر ہر اک نشیب و فراز
سنبھل سنبھل کے قدم رہ گزر میں رکھتا ہوں

(۵)

جنوں کے راز، دیوانہ کہے گا تم بھی سُن لینا
دلِ وحشی کا افسانہ کہے گا، تم بھی سُن لینا

وہ دل جس سے مٹائے دے رہے ہو یاد تم اپنی
زمانہ اس کو ویرانہ کہے گا، تم بھی سُن لینا

ہو آشفتہ کیوں کر شمعِ کشتہ کے اشارے پر
رموزِ عشق پروانہ کہے گا، تم بھی سُن لینا

دلِ وحشت زدہ مجبور ہو کر ذرّے ذرّے سے
محبت کا جب افسانہ کہے گا، تم بھی سن لینا

وہی ساقی جو میرے ظرف پر کل طنز کرتا تھا
مری آنکھوں کو پیمانہ کہے گا، تم بھی سُن لینا

میکش امروہوی

(۱)

درد بھی دل میں نہیں کوئی تمنا بھی نہیں
میں تجھے بھولنے والے ابھی بھولا بھی نہیں
یہ ترا وعدۂ فردا کوئی بیجا بھی نہیں
زندگی کا مگر اے دوست بھروسا بھی نہیں
لا کے چھوڑا ہے وہاں پر مری وحشت نے جہاں
دور تک اب کسی دیوار کا سایا بھی نہیں
اُس کو حالات نے مجبور کیا ہے شاید
بے وفا کیسے کہا جائے وہ ایسا بھی نہیں
ہم تو اُس عالمِ حسرت میں ہیں میکش کہ جہاں
کوئی پیغامِ محبت کبھی آتا بھی نہیں

۲

ہائے وہ میری داستان کے لوگ
یاد آتے ہیں اُس مکان کے لوگ

چاند تاروں سے کیجیے پردہ
چاند تارے ہیں آسمان کے لوگ

دھوپ میں ہم کبھی رہے ہی نہ ۔
ایسے ہوتے تھے سائبان کے لوگ

اے مری جان، میری جان نہ بن
دشمنِ جاں ہیں میری جان کے لوگ

میں بھی اب بے زبان رہتا ہوں
جب سے بچھڑے مری زبان کے لوگ

٣

وہ شہر یار وہ ابنِ ملول کیسے ہیں
تمھارے باغ کے برگد، ببول کیسے ہیں
میں اپنا گھر جنھیں غربت میں بیچ آیا تھا
نہ جانے اب وہ عنایت رسول کیسے ہیں
تمھارے بھائی بہن کا ہے کیا طریقہ اب
تمھارے باپ کے بیجا اصول کیسے ہیں
تمھاری سیکڑوں سکھیوں کی یاد آتی ہے
لکھو، گدائے جمالِ بتول کیسے ہیں
تمھاری مانگ میں جن کو سنوارتا تھا کبھی
تمھارے گھر کی چمیلی کے پھول کیسے ہیں

ناداںؔ : اندر سروپ دت ناداںؔ

(۱)

بار ہا ٹوٹ کر بنا ہوں میں
ڈوبتی ناؤ کی انا ہوں میں
خود ہی ملزم ہوں، خود ہی منصف ہوں
اپنے ہی روبرو کھڑا ہوں میں
میری مٹّی بھی کیا عجب شے ہے
برف باری ہے جل رہا ہوں میں
جن پہ رنج و الم کے پہرے ہیں
ان گھروندوں کا مُدّعا ہوں میں
جس طرف سے بھی آئے، آئے ہَوا
اپنے گھر کی طرح کھُلا ہوں میں
پھر رہا ہوں ازل سے خانہ بدوش
کس بگولے کی انتہا ہوں میں
حرف آئے گا مجھ پہ کیا ناداںؔ
ایک درویش کی صدا ہوں میں

۲

اور کیا ہے تیری بستی میں پریشانی مجھے
ہر قدم پر ٹوکتی ہے مرگ سامانی مجھے

دو پرندے ایک ہی پتھر سے مارے وقت نے
آگ بستی کو عطا کی ، آنکھ کا پانی مجھے

جس کا وعدہ تھا کہ پہنائے گا تاروں کی قبا
جاتے جاتے دے گیا ملبوسِ عریانی مجھے

آئینہ اور اپنی صورت یہ ہے تیری کائنات
کیا کرے گا مشتعل اپنا ہی زندانی مجھے

میرا چپ رہنا بھی اے ناداں بہت مہنگا پڑا
بخش دی قاتل نے مقتل کی نگہبانی مجھے

(۳)

یہ شہرِ وعدہ فروشاں، یہ بستیاں یارو
نشاط اوڑھ کے رقصاں ہیں تلخیاں یارو
کوئی کلنک لگاؤ کسی کے ماتھے پر
بہت اداس ہیں تہمت طرازیاں یارو
نکل کے اپنے گھروں سے پڑو نہ خطرے میں
گلی کے موڑ پہ بیٹھی ہیں آندھیاں یارو
تمہارے جسم سے جنگل کی باس آتی ہے
کہاں سے سیکھی ہیں یہ شہرداریاں یارو
کہاں گئے ہیں وہ ناداں جواں کے محرم تھے
کہاں گئی ہیں وہ خوابوں کی وادیاں یارو

(۴)

ہر گلی کے موڑ پر تیرا کہا موجود ہے
پھر بھی اس بستی میں پُرکھوں کی دُعا موجود ہے
یہ اندھیرے کھا گئے ہوتے متاعِ زندگی
وہ تو کہیے ہم فقیروں کی صدا موجود ہے
ہو رہی ہیں پھر کہیں بن باس کی تیاریاں
ٹوٹتے رشتوں میں راون کی انا موجود ہے
کیا ہوئیں دشتِ شفا کی حاشیہ آرائیاں
زندگی مفلوج، دردِ لا دوا موجود ہے
کچھ تو مجھکو دشتِ غم سے آنے والے پنچھیو
کیا وہاں اب تک وہی وحشی ہوا موجود ہے
سُرخرو کیسے ہوا؟ کیوں کر ہوا؟ کالا شجر
کیا جڑوں میں اُس کی کوئی دیوتا موجود ہے
بیٹھ کر ساحل پہ ناداں صورتِ طوفاں نہ دیکھ
ڈوبتی کشتی میں تیرا مدعا موجود ہے

نظمی : مہدی نظمی

(۱)

زخمِ تعبیرِ تمنّا نہیں سلنے والا
زندگی میں نہ ملا خواب میں ملنے والا
اس کی یادوں میں نظر آتا ہے اس کا پیکر
روز ملتا ہے مجھے ، مجھ سے نہ ملنے والا
اے جنوں والو نہ مہکے گی فضائے صحرا
غنچۂ زخمِ بیاباں نہیں کھلنے والا
کیفیت بخشے تو تلخی بھی پسندِ خاطر
پھر لبِ طنز سے پیمانہ ہے ملنے والا
ہر تعلق کو مفادات بدل دیتے ہیں
مدتوں ملتا نہیں روز کا ملنے والا
اجنبی بن گیا خود اپنے وطن میں نظمی
پوری بستی میں نہیں ایک بھی ملنے والا

(۲)

نگاہِ یار اٹھے ساغرِ شراب چلے
کبھی تو برق کے ہمراہ آفتاب چلے

تری تلاش میں دار و رسن کی راہوں سے
کبھی چلے تو ہمیں خانماں خراب چلے

پہنچ گئے ہیں اُسی موڑ پر خرد والے
جہاں سے اہلِ جنوں سُوئے انقلاب چلے

ہے حُسن و عشق میں پردہ نگاہ کا ورنہ
وہ جب بھی دل میں چلے ہیں تو بے نقاب چلے

سفینہ کیا ہے کنارے بھی تھرتھراتے ہیں
ذرا بگڑ کے ہوا سے جو موجِ آب چلے

وہ رہگزارِ تصور سے یوں گزرتے ہیں
نکل کے سیر کو جیسے نگاہِ خواب چلے

کفِ حنائی پہ نظمی وہ رقصِ پیمانہ
شفق میں جیسے سرِ شام آفتاب چلے

(۳)

بھیگی ہوئی ہے خونِ جگر سے، پلک، پلک
تیرے کرم کا شکریہ اے گردشِ فلک

تیرا بدن کہ روپ میں جیسے کنول کا پھول
تیرا لباس، رنگ میں جیسے پرِ تلک

صبحِ ازل سے شامِ ابد تک ترا ظہور
پھر طالبانِ دید سے یہ پردہ کب تلک

اب تو بھی سوچ کیا ہے ترے روپ کا اثر
دکھلا رہا ہے آئنہ تجھ کو تری جھلک

ساقی کی دوستی پہ نہ جاؤ کہ ہے کشو
ساقی سے دوستی تھی ہماری بھی کل تلک

نظمی امیدِ وصل میں شامِ فراق، دل
جلتا رہا چراغ کی صورت سحر تلک

۴

ابروؤں میں ہے کشش رنگ سا رخساروں میں
آب دی جاتی ہے تلواروں کو انگاروں میں

درد کا مول کہاں ہوگا خریداروں میں
اشک موتی نہیں بک جائیں جو بازاروں میں

باغباں سنتا ہوں کانٹے نکل آئے ہیں وہیں
میری قسمت کے جہاں پھول تھے گلزاروں میں

جب ہوا شیش محل کوئی زمیں بوس کہیں
زندہ انسانوں کے ڈھانچے ملے دیواروں میں

اہلِ دل غم کی حمایت میں منظّم نکلے
کتنی تاثیر تھی زنجیر کی جھنکاروں میں

قید کب ہوتا ہے زنداں میں ضمیرِ آزاد
سر کے ٹکرانے سے در بنتے ہیں دیواروں میں

حشر کے روز بھی ہوں سب سے الگ اے نظمی
میں علامت ہوں گناہوں کی گنہگاروں میں

۵

جب بھی پائی ہے تری چشمِ کرم دل کی طرف
میں نے دیکھا ہے تہی دامنِ حاصل کی طرف
شہرِ جاناں میں ذرا اور چراغاں کردو
رکھ دو جلتے ہوئے زخموں کے دیے دل کی طرف
کوئی قاتل نہ بچے گا کہ شہیدوں کا لہو
آپ ہوتا ہے رواں دامنِ قاتل کی طرف
عشرتِ قتل گہِ شوق کو قاتل دیکھے
آئینہ رکھ دے کوئی صورتِ بسمل کی طرف
شور رہبر کا ہو یا فتنۂ رہزن نظمی
ہم تو راہی ہیں بڑھے جائیں گے منزل کی طرف

نقشؔ: مہیش چند نقشؔ

(۱)

وہ جسمِ ناز کچھ اس طرح سے لہکتا ہے
بھری بہار میں جیسے چمن مہکتا ہے
سرشکِ خوں جو مژہ سے مری ڈھلکتا ہے
جگر میں شعلۂ غم اور بھی بھڑکتا ہے
یہ نشّہ اور یہ سرشاریاں یہ گُم شُدگی
نگاہِ مست سے اک کیف سا چھلکتا ہے
یہ موجِ برقِ تصوّر یہ تیرگیِ الم
اندھیری رات میں کوندا سا اک لپکتا ہے
جہانِ زیست کا میں ترجمان ہوں اے نقشؔ
کہ میرے سینے میں دُنیا کا دل دھڑکتا ہے

۲

زُلفِ سیاہ و عارضِ تاباں کی یاد ہے
شامِ بہار و صبحِ درخشاں کی یاد ہے
کھلتا ہوا چمن وہ مہکتا ہوا بدن
رعنائیِ بہارِ گلستاں کی یاد ہے
وہ عالمِ شباب وہ جلوے وہ زندگی
رقصِ نگاہ و قلبِ غزل خواں کی یاد ہے
دمکی تھی جس کے نور سے پیشانیِ حیات
اُس نور بار شمعِ شبستاں کی یاد ہے
ترکِ تعلقات کو مدّت ہوئی مگر
اب تک کسی سے وعدہ و پیماں کی یاد ہے

نیرؔ ذکیہ سلطانہ نیرؔ

(۱)

دل کو چاک جگر کو زخمی آنکھوں کو خونبار کیا
اب کے جنوں میں ہم نے ایسے مقدمِ فصلِ بہار کیا
فکر و نظر پر تو چھایا ہے مہرِ نہاں سے تو پیدا ہے
سو پہلو ایمان کے نکلے جس نے بھی انکار کیا
تم تو اب تک شیخ و برہمن اک رشتہ بھی توڑ نہ پائے
ہم نے اپنے صنم کی خاطر سُبحے کو زنّار کیا
قربت کے جذبات نے پاٹے لاکھ سمندر پل بھر میں
دوری کے احساس نے نیرؔ ذرّے کو کہسار کیا

(۲)

حُسن کے ذوقِ ستم کو خود جگا دیتی ہوں میں
چوٹ جب پڑتی ہے دل پہ مسکرا دیتی ہوں میں
آستاں کی قید سے آزاد ہے ذوقِ سجود
جب خیال آتا ہے دل میں سر جھکا دیتی ہوں میں
میں کسی کے سامنے بھی شرحِ غم کرتی نہیں
سننے والے جبر کرتے ہیں سنا دیتی ہوں میں
برق شرمائی ہوئی ہے ذوق ہے تسکین طلب
جمع کر کے چند تنکے خود جلا دیتی ہوں میں
ایک ہی قصّہ ہے نیّرؔ زندگیِ عشق کا
مختلف عنوان سے اس کو سنا دیتی ہوں میں

واجد سحری

۱

بھرا ہے کانٹوں سے قلبِ ملول کا دامن
ہے چاک جرمِ تبسم میں پھول کا دامن

اسی طرح مری سانسیں لیے پھریں مجھ کو
ہوا کے ہاتھ میں جیسے ہو پھول کا دامن

اڑانا چاہیں زمانے نے دھجیاں میری
نہ چھوڑا ہاتھ سے میں نے اصول کا دامن

یہ کون شاخ پہ سر رکھ کے رات بھر رویا
کہ بھیگا بھیگا ہے ہر ایک پھول کا دامن

چھوا ہے جب بھی، لہو انگلیوں سے ٹپکا ہے
قبائے جاں ہے مری، یا ببول کا دامن

جو خون ہم نے دیا تھا وہ رنگ لایا ہے
بہت ہی دلکش و رنگیں ہے پھول کا دامن

نہیں ہے خلعتِ شاہی کی آرزو واجد
مری متاعِ طلب ہے رسولؐ کا دامن

(۲)

بے وفاؤں سے بھی رشتہ ہے وفا کا جاناں
کبھی چاہت کا صلہ ہم نے نہ چاہا جاناں
ہو گئی شام، پرندے نہیں لوٹے لیکن
ہر شجر میری طرح رہ گیا تنہا جاناں
عہدِ رفتہ کے حوالے سے کُریدو نہ مجھے
دل طلب گار رہے اپنا نئے غم کا، جاناں
اپنی آنکھیں نظر آتی ہیں بہت آنکھوں میں
تجھ سے ملتا ہوا چہرہ نہیں ملتا جاناں
کاٹ دی عمر اندھیروں کو پتا ہیں دیتے
اپنی جھولی میں بھی ایک آدھ سویرا جاناں
اب زمانہ مجھے بدنام کرے گا کیسے
میں سناتا ہی نہیں درد کا قصّا جاناں
بات بوڑھوں کی طرح کرتا ہے واجد سحری
وقت سے کیا بہت آگے نکل آیا جاناں

(۳)

چھلکا، شرابِ حسن نہ آنکھوں کے جام سے
قدرِ شراب پوچھ کسی تشنہ کام سے
کرنوں سے میرا دامنِ جاں ہے بھرا ہوا
اُبھرا ہے کوئی چاند گریبانِ بام سے
وابستہ ہو چکی ہے مری تلخ زندگی
ساقی سے، میکدے سے، صراحی سے، جام سے
اتنا مرے وجود میں تُو جذب ہو گیا
خود کو پکارتا ہوں میں اب تیرے نام سے
کچھ ایسی اُن کے نین کٹوروں سے پی چکے
نفرت سی ہو چکی ہمیں صہبا سے جام سے

(۴)

کپڑے بھیگے ہوئے سکھانے لگے
دھوپ کی پیاس ہم بجھانے لگے
ذکر تھا آستیں کے سانپوں کا
آپ کیوں پیچ و تاب کھانے لگے
ہیں میسّر اُنھیں چراغ مگر
ضد ہے کیا جو ہمیں جلانے لگے
اللہ اللہ یہ انقلابِ جہاں
راستہ راہزن بتانے لگے
گھر نہیں آئے وہ ابھی واجد
دیپ سے دیپ ہم جلانے لگے